وَخَلَقۡنٰکُمۡ اَزۡوَاجًا○
(سورۃ النبا، القرآن الکریم)

اسلاف کی باکمال بیویاں

مرتّب

مفتی ابوالقیّم ظہیر احمد ملّی
(استاذ و مفتی دارالافتاء معہد ملّت، مالیگاؤں)

طابع و ناشر
مکتبۂ نصیر الاسلام
پواروواڑی، مالیگاؤں

سلسلہ مطبوعات نمبر ۱۳

الدنیا کلھا متاع وخیر متاع الدنیا المرأۃ الصالحۃ
(مسلم شریف)

اسلاف کی باکمال بیویاں

مرتِّب

مفتی ابو القیم ظہیر احمد ملّی
(استاذ و مفتی دار الافتاء معہد ملت، مالیگاؤں)
Mob:8623925611

طابع وناشر

مکتبۂ نصیر الاسلام پوار واڑی مالیگاؤں

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: اسلاف کی باکمال بیویاں
مرتب: مفتی ابوالقیم ظہیر احمد ملی
(استاذ و مفتی دارالافتاء معہد ملت، مالیگاؤں)
طابع و ناشر: مکتبۂ نصیر الاسلام، مالیگاؤں
سن اشاعت: صفر المظفر ۱۴۴۵ھ مطابق ستمبر ۲۰۲۳ء
کل صفحات: ۷۲
تعداد : 1000
قیمت : -/50
کمپوزنگ: رضوان حارث، اعظم پورہ، مالیگاؤں 9270315468

کتاب حاصل کرنے کے لیے رابطہ کریں

(۱) مفتی ابوالقیّم ظہیر احمد ملی (استاذ و مفتی معہد ملت، مالیگاؤں) 8623925611

(۲) حضرت مولانا زبیر احمد ملی ندیمی (استاذ معہد ملت، مالیگاؤں) 9922859323

(۳) مفتی محمد فیضان ملی ندوی صاحب (امام و خطیب نذیریہ مسجد، مالیگاؤں) 8208467577

(۴) مولانا احمد فراز ملی صاحب (ناظم مدرسہ مشکوٰۃ الخیر، مالیگاؤں) 8087626212

(۵) حافظ مقیم احمد صاحب ملی (امام و خطیب مسجد ساجدہ محمد یعقوب، مالیگاؤں) 9028926016

(۶) مولانا محمد حذیفہ صاحب ملی (استاذ شعبۂ مکتب معہد ملت، مالیگاؤں) 8149778879

(۷) مفتی ابوالقیم ملی (ناظم مکتبہ نصیر الاسلام، پوارواڑی، مالیگاؤں) 8623925611

فہرست

نمبر شمار	عناوین	اصحاب قلم	صفحہ نمبر
الف	عرض مرتب	مفتی ابوالقیم ظہیر احمد ملی (استاذ و مفتی دار الافتاء معہد ملت)	4

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
1	محترمہ خاتون بیگم زوجہ مولانا عبدالحمید نعمانیؒ (بانی معہد ملت، مالیگاؤں)	7
2	محترمہ زلیخا بیگم بنت آفتاب الدین زوجہ مولانا ابوالکلام آزادؒ (اولین وزیر تعلیم حکومت ہند)	14
3	محترمہ امجدی بانو بنت عظمت علی خان زوجہ مولانا محمد علی جوہرؒ (بانی تحریک خِلافت)	31
4	محترمہ عفت النساء بنت شیخ محمد یوسف الزماں زوجہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (صاحب تفسیر ماجدی)	37
5	محترمہ حلیفہ خاتون بنت مولانا حافظ محمود رامپوری زوجہ قاری محمد طیب صاحبؒ (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند)	45
6	محترمہ آفتابی بیگم والدہ مولانا خلیل الرحمن سجاد نعمانی زوجہ مولانا محمد منظور نعمانیؒ (بانی و مدیر اول الفرقان، لکھنؤ)	56
7	محترمہ سنجیدہ بیگم والدہ مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی زوجہ مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیریؒ (بانی جامعہ امام انور شاہ دیوبند)	65

عرض مرتب

اللہ رب العزت نے قرآن پاک کی سورۂ ابراہیم آیت نمبر ۳۴ میں سچ فرمایا ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کر سکتے، سر سے لے کر پاؤں تک اور صبح سے لے کر شام تک بلکہ صبح ولادت سے شام موت تک انسان کے لیے نعمت ہی نعمت ہے اور وہ نعمت خداوندی سے فیضیاب بھی ہو رہا ہے۔ لیکن ان نعمائے خداوندی اور انعاماتِ باری تعالیٰ میں ایک نعمت و انعام ایسا ہے جس کو بندگان خدا کی ایک بڑی تعداد نعمت و انعام نہیں سمجھتی وہ نعمت ہے ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کی حدیث کے مطابق نیک بیوی جیسا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: الدُنیا کلھا متاع وخیر متاع الدنیا المرأۃ الصّالحۃ. (مسلم شریف) کہ پوری دنیا فائدہ اٹھانے کی چیز یعنی نعمت ہے اور دنیا کی بہترین نعمت نیک بیوی ہے۔ بیوی چند ہی مردوں کے علاوہ ہر ایک کو ملتی ہے۔ جس پر قرآن کریم شاہد ہے کہ وخلقنا کم ازواجاً (سورۃ النبا آیت نمبر ۸) "ہم نے تمہیں جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا ہے، لیکن چند ہی لوگ ہوتے ہیں جن کو نیک وصالح بیوی نصیب ہوتی ہے اور جو نیک وصالح ہوتی ہے وہ لازماً مطیع وفرمانبردار بھی ہوتی ہے اس لیے کہ ہر مطیع وفرمانبردار بیوی نیک وصالح نہیں ہوتی لیکن ہر نیک صالح مطیع وفرمانبردار ہوتی ہے، اور مذکورہ اوصاف کی بیوی جن کو نصیب ہوتی ہے ان کی دنیا بھی جنت بن جاتی ہے کہ والدین ان سے راضی وخوش اور اولاد بھی ان کی اطاعت گذار وفرمانبردار بن جاتی ہے۔ جب کہ بیوی اگر نیک وصالح نہ ہو تو معاملہ بالکل برعکس ہوتا ہے اور مرد کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی سورہ فرقان کی آیتوں میں عباد الرحمن یعنی اللہ تعالیٰ کے بندوں کے اوصاف میں یہ وصف بھی بیان کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ ہمارے پروردگار ہمیں اپنی بیوی بچوں سے

آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما یعنی انہیں نیک و صالح اور مطیع و فرمانبردار بنا، اسی طرح سیدولد آدم محمد عربی ﷺ کی مسنون دعاؤں میں یہ دعا ملتی ہے یا وھّابُ! ھَبْ لَنَا زَوْجَۃً صَالِحَۃً کہ اے بہت زیادہ عطا کرنے والے! ہمیں نیک وصالح بیوی عطا فرما۔ لہٰذا ہر مجرد (غیر شادی شدہ) کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے نیک وصالح بیوی کے لیے مذکورہ دعاؤں کا اہتمام کرے اور ہر ماں باپ نیز بھائی کو چاہیے کہ وہ اپنی بیٹی اور بہن کو نیک وصالح دلہن بنانے کے جتن کرے اور شوہر کو چاہیے کہ وہ اپنی بیوی کو مطیع و فرمانبردار بنانے کے لیے حتی الامکان کوشش کرے تاکہ ازدواجی زندگی خوشگوار گذر سکے، اس کے لیے دعا کے ساتھ ساتھ انبیاء کرام، صحابہ کرام اور اسلاف کی نیک وصالح اور باکمال و بے مثال بیویوں کے حالات زندگی بطور خاص ان کے اپنے شوہروں سے حد درجہ محبت، خدمت اور ایثار سے واقف کرانے کی کوشش کرے۔

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا مطلوب اسلامی معاشرہ کئی خاندانوں سے مل کر وجود میں آتا ہے، اور خاندان کی بنیادی اکائی میاں بیوی ہیں، ان کا آپس میں مضبوط، پائیدار، خوشگوار، پیار و محبت کا تعلق اساسی پتھر ہے، اسی کی تنصیب کے لیے اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کو تاکیدی نصیحتیں کی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے وعَاشِرُوھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ. (سورۂ نساء) دوسری آیت وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً. اور وَخَلَقْنَاکُمْ اَزْوَاجًا.

ان الٰہی ہدایات پر سب سے پہلے انبیاء کرام نے عمل کر کے مثالی نمونہ سب کے لیے پیش کیا ہے، آخر میں ہمارے رسول ﷺ ان تعلیمات کا مکمل نمونہ ہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا استوصوا بالنساء خیرا اور خیرکم لأھلہٖ وَاَنا خیرکم لأھلی.

شیطان جب اپنی شورائی مجلس منعقد کرتا ہے تو اس شیطان کے کارناموں پر سب سے زیادہ خوشی کا اظہار کرتا ہے جو میاں بیوی میں تفریق ڈال دیتا ہے، اور اس بچے کو جو تعلیم کے لیے جاتا ہے اس کو راستے سے بہکا دیتا ہے، اس کی بھی بہت تعریفیں کرتا ہے۔

یہود، بنی اسرائیل کا ایک بگاڑ یہ بھی تھا کہ وہ مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ یعنی میاں اور بیوی کے درمیان تفریق پیدا کرتے تھے۔ لہٰذا ہم اگر مومن ہیں اور دنیا و آخرت کی سرخروئی و کامیابی چاہتے ہیں تو ہمیں ان انبیاء کرام اور آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نمونہ اختیار کرنا چاہیے اور اپنی گھریلو زندگی کو جنت کا نمونہ بنانا چاہیے۔

چنانچہ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر بندہ نے زیر نظر کتاب ''اسلاف کی با کمال بیویاں'' ترتیب دی ہے تا کہ ہماری ماؤں، بہنوں بیٹیوں اور بیویوں کے سامنے وہ (اسلاف کی بیویاں) بطور نمونہ ہوں اور یہ (ہماری مائیں وغیرہ) ان کے نقش قدم پر چل کر اپنی زندگی خوش گوار بنائیں۔ کتاب ہذا میں ملک گیر بلکہ عالم گیر سات درج ذیل اسلاف کی با کمال بیویوں کا تذکرہ ہے۔ مولانا عبدالحمید نعمانی (بانیٔ معہد ملت مالیگاؤں) مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، قاری محمد طیب صاحبؒ، مولانا محمد منظور نعمانیؒ اور مولانا محمد انظر شاہ کشمیریؒ، شروع کے تین اکابر کی بیویوں پر مضامین دوسرے اکابر نے اور بقیہ چار اکابر کی بیویوں پر مضامین خود انھوں نے رقم فرمائے ہیں۔

آخر میں بندہ ان تمام معاونین کا تہ دل سے شکر گزار ہے جنہوں نے کتاب کی تیاری میں معاونت کی ہے۔ بطور خاص استاذ الاساتذہ حضرت مولانا عبدالقدیر ملی صاحب کا جنہوں نے کتاب کی پروف ریڈنگ کے ساتھ ساتھ مفید مشورے بھی دیئے۔ نیز میرے محترم بزرگ ماسٹر شیخ محمود شیخ عبداللہ صاحب (نائب چیف ٹرسٹی مسجد ساجدہ محمد یعقوب) اور بندہ کی اہلیہ ام القیم بنت اخلاق احمد انصاری کا بھی جن کے حوصلہ بخش کلمات نے کام میں قوت عطا کی، اللہ تعالیٰ اس کتاب کو شرف قبولیت سے نوازے اور راقم اور اس کے والد نصیر احمد ابن خلیل احمد، والدہ زبیدہ بانو بنت محمد سلیم کے لیے ذخیرہ آخرت بنائے اور احقر کو پورے اخلاص کے ساتھ مزید علمی و دینی خدمات کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

فقط ابوالقیم ظہیر احمد ملی

۱۹ر صفر ۱۴۴۵ھ بدھ ۵ر ستمبر ۲۰۲۳ء

حضرت مولانا عبدالحمید نعمانی(۱) (بانئ معہد ملت، مالیگاؤں) کی بیوی

(۱) محترمہ خاتون بیگم

بیوی انسانی زندگی میں مشین کے ضروری کل پرزے کی طرح ہے، جس کے بغیر کارزارِ حیات بیکار، بے نور اور نامکمل ہے۔ یہی نہیں زندگی کی مشکلات پر قابو پانے، مقاصد کی تکمیل اور چمن زارِ زیست کو سدا بہار بنانے کے لیے کلیدی مقام رکھتی ہے۔ انسان کی تاریخِ عزیمت گواہ ہے کہ زندگی کے نازک ترین اور صبر آزما حالات میں اسی عورت کی دستگیری نے مرد کو مقامِ ولایت پر پہنچایا ہے۔ جو عورت نازک ترین حالات میں شوہر کے دکھ درد اور اس کی سرگرمی کو نہ سمجھ سکے تو اس سے معرکۂ حیات میں کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔

مولانا نعمانی صاحبؒ خوش نصیب تھے کہ ان کی بیوی بھی مولانا آزاد کی اہلیہ کی طرح ایثار پیشہ، مردم شناس، منکسر المزاج، صبر و استقلال کی مالک اور شوہر کے جاں گسل حالات

(۱) مجاہد آزادی مولانا نعمانی کا مکمل نام عبدالحمید ابن عظیم اللہ عرف پیارے حاجی ہے۔ آبائی وطن:۔ مبارکپور ضلع اعظم گڑھ یوپی، تاریخ پیدائش: ۱۸۹۲ء مالیگاؤں، مادرِ علمی: مدرسہ بیت العلوم مالیگاؤں و مدرسہ الٰہیات کانپور، خصوصی اساتذہ کرام: مولانا محمد اسحاق مقصدؔ مالیگانوی نقشبندی، مولانا عبدالقادر آزاد سبحانی، مولانا عبدالحلیم صدیقی اور مولانا وصی علی ملیح آبادی، فراغت: ۱۹۱۸ء مدرسہ الہیات کانپور، تصانیف: کفاک علماً بالعربیۃ (چار حصے) تاجِ آفرینش، حضرت عثمانؓ صرف تاریخ کی روشنی میں، حضرت علیؓ تاریخ اور سیاست کی روشنی میں وغیرہ۔ مناصب: ناظم معہد ملت مالیگاؤں، صدر جمعیت علماء مالیگاؤں و ممبئی، رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو، رکن تاسیسی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ دہلی، رکن مجلس مشاورت نئی دہلی، بانی و صدر امتحان دینیات مالیگاؤں، ناظم دائرہ ادبیہ مالیگاؤں، امام و خطیب جونی مسجد بیلباغ مالیگاؤں، ایڈیٹر بیداری مالیگاؤں، اجمل ممبئی، مدیر تحریر ثقافۃ الہند دہلی، ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو عربی سیکشن دہلی، خصوصی تلامذہ: مولانا محمد حنیف ملی قاسمی قاضی عبدالاحد ازہری اور مولانا عبدالحمید ازہری، وفات: ۲۰ر جنوری ۱۹۸۳ء مطابق ۵ر ربیع الثانی ۱۴۰۳ھ بروز جمعرات مالیگاؤں

میں حوصلہ نہ ہارنے والی تھیں۔ مولانا کی بیوی ان کے عزیزوں ہی میں تھیں۔ بیت العلومؒ سے فراغت کے بعد ۱۹۱۸ء میں مولانا کا ان سے نکاح ہوگیا۔ اہلیہ اگرچہ تعلیم سے نابلد، عصری تقاضوں سے بے بہرہ عام عورتوں کی طرح ایک خاتون تھیں۔ تاہم خاندانی شرافت، علماء کا احترام، دین و مذہب سے لگاؤ کے ساتھ اسلامی قدروں کی آشنا تھیں۔ اس لیے مولانا نے دوسرے گھرانوں کی عورتوں پر اس مشرقی خاتون ہی کو ترجیح دیا اور ساٹھ سال سے زائد زمانہ مرحومہ نے بڑے صبر و شکر کے ساتھ مولانا کے ساتھ گزار دیا لیکن شیشہ سے زیادہ نازک مزاج وضمیر میں کبھی بال نہیں آنے دیا۔

ازدواجی زندگی کا زمانہ انتہائی عسرت اور مفلسی کا تھا۔ ویسے بھی مالیگاؤں میں زندگی گزارنے کے ذرائع کم ہی تھے۔ غربت وافلاس کے ساتھ کوئی فوری سہارا نہ ہونے کی بنا پر مولانا نے کسب معاش کے لیے مالیگاؤں کو خیر باد کہہ کر در در کی خاک چھاننا شروع کیا۔ لیکن بادِ مخالف سے مایوس نہیں ہوئے۔ بیوی کی دوری اور مجبوری خود مولانا کے لیے بڑا امتحان تھی اس پر مستزاد یہ کہ مایوسیوں نے معرکۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ بایں ہمہ مولانا کہیں بھی ہوں گزر بسر کے لیے کچھ نہ کچھ بھیجتے رہے۔

مادرِ ملت خاتون مرحومہ خود فرماتی ہیں کہ غربت کے باوجود اگرچہ زندگی میرے لیے کسی طرح امتحان سے کم نہ تھی لیکن مجھے زندگی کا جتنا سکون تھا، مالیگاؤں آجانے کے بعد نہیں ملا۔ یہ جملے شاعری نہیں بلکہ ایک ایسی شریف خاتون کے سچے احساسات ہیں جنہیں بچپن ہی سے اسلامی روایات کے سائے میں زندگی گزارنے کا موقع ملا تھا، مولانا کی غیر موجودگی میں انہیں جن حالات کا سامنا رہا، اس میں خوش مزاج اور استقلال کے ساتھ جیتے رہنا، ایک مردم شناس اور وفا پیشہ خاتون ہی کا وصف ہے بیگم خاتون مجھ سے جب اپنا دردِ دل سناتی تھیں، پیمانہ ضبط چھلک اٹھتا تھا۔

مولانا نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی اہلیہ سے بے پناہ محبت تھی مگر معاش کے لیے

صحرا نوردی اور اپنے سیاسی و تعلیمی مشاغل پر کبھی غالب نہیں آنے دیتے۔ وہ چونکہ مولانا کی مزاج شناس تھیں۔ اس لیے اپنے کسی اقدام سے اس رشتۂ محبت میں فرق نہیں آنے دیتی تھیں۔ حتی الامکان ان کی کوشش ہوتی کہ اپنی طرف سے کوئی چھوٹا سا بھی ایسا کام نہ ہو جو ناراضگی کا باعث ہو، بلکہ ان کی خدمت اور راحت رسانی میں لگ کر ان کے غم کو کافور کرتی تھیں جو ایک شوہر کو گردشِ ایام کی طرف سے بطور تحفہ ملتا ہے۔

۱۹۳۰ء میں مرحومہ مولانا کے قیامِ بمبئی اور آلام روزگار پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ میں نے اپنی سعادت سمجھ کر غریب الوطنی کی زندگی میں حتی المقدور کوشش کی کہ مولانا کو ذرا بھی ناگواری ہونے نہ پائے۔ اس زمانے میں جہاں لوگ بمبئی میں لاکھوں میں کھیلتے تھے، یہاں کمر سیدھی کرنے کے لیے کوئی صورت میسر نہیں تھی۔ خالص پانی میں نمک گھول کر ہوٹل کی تندوری روٹی کے ساتھ جو مزہ کھانے میں آتا تھا، آج کوفتہ بریانی اور مرغّن غذاؤں میں کہاں ملتا ہے۔ اس قناعت پسند زندگی میں خاتون بیگم کا یہ حوصلہ قابل قدر اور قابل تقلید ہے کہ کائنات برہم ہو جائے مگر مولانا کی ناگواری نہ ہو سکے، ورنہ میری عاقبت خراب ہو جائے گی۔

مولانا نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ قوم کا سچّا درد رکھنے والے آزاد منش انسان تھے۔ ملت کے درد کے آگے وہ اپنی بیوی اور گھر کا درد بھی بھولے ہوئے تھے۔ اسفار کی کثرت اور قومی و ملّی کاموں کی مصروفیت کی وجہ سے اہلیہ پر وہ توجہ نہیں تھی جو چاہیے۔ خاتون بیگم اگرچہ بشری تقاضہ کے مطابق مولانا کے اس طرزِ عمل سے اثر بھی لیا کرتی تھیں لیکن خود کہتی بھی تھیں کہ مولانا کی جو مصروفیت اور ان کی جو ذمہ داری ہے اگر وہ یہاں رہیں تو میں پورا بھی تو نہیں کر سکتی۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ان حالات میں صبر و استقلال سے کام لیتے ہوئے فرماتی تھیں کہ میں ان کی سرگرمیوں سے مطمئن ہوں۔ وہ قومی کاموں میں لگے رہیں۔ آخر ان کے اجر میں میرا بھی تو حصہ ہو گا۔ بلکہ بسا اوقات یہ بوڑھی ماں فرطِ جذبات میں آ کر ہم لوگوں سے کہتی تھیں کہ آخر تم لوگ کس مرض کی دوا ہو۔ اب مولانا کو آرام ملنا چاہیے۔ لیکن قوم کی خدمت مرضِ لا دوا ہے۔

زندگی بھر آدمی کو اس سے کہاں فرصت؟ یہ مرض مولانا کے ساتھ ہی چلا گیا۔

مولانا کہیں لمبے سفر پر جانے لگتے تو اہلیہ بڑے حوصلے کے ساتھ رخصت کرتیں بلکہ دروازے تک آ کر خدا حافظ بھی کہتیں اور یہ ضرور کہہ دیا کرتی تھیں کہ جس مقصد سے جارہے ہو اس کی زیادہ فکر کرنا۔ ہم لوگوں کا خدا حافظ ہے۔ ان جملوں کے ساتھ ان کے لب خاموش اور مضطرب چہرے کی لکیریں اس بات کی غماز ہوتی تھیں کہ انہیں مولانا کی جدائی بہت گراں گزرتی تھی، لیکن مادر ملت رحمہا اللہ قوم کے لیے اسے بھی زندگی بھر انگیز کرتی رہیں۔

مولانا کی بیوی بڑی خوش سلیقہ خاتون تھیں۔عسرت اور تنگی کے باوجود روپیہ پس انداز کر کے کوشش کرتی تھیں کہ مولانا کو اچھے اور عمدہ کھانے پیش کرتی رہیں۔ مرحومہ جب تک زندہ رہیں اپنے ہاتھ سے نفیس و لذیذ کھانا پکا کر دیتی رہیں اور جو بچ رہتا، پھر وارث ہونے کی بنا پر ہم لوگوں کا حصہ ہوتا تھا، جس پر مولانا کی بیوی حد سے زیادہ مسرت کا اظہار کرتی تھیں۔ ان کی کوئی اولاد چوں کہ زندہ نہیں رہی اس لیے وہ معہد ملت کے بچوں سے بے پناہ محبت کرتیں اور اپنے بچوں کی طرح ان کے دکھ درد کو دور کرنے میں لگی رہتی تھیں۔ ان کی محبت بھری باتوں میں اتنی کشش تھی کہ ہم لوگ ان کے یہاں گھر کے ایک فرد کی طرح آتے جاتے تھے۔

مرحومہ بڑی بلند ہمت اور حوصلہ مند خاتون تھیں۔ فسادات کے زمانے میں وہ دل سے چاہتی تھیں کہ مظلوموں کی دادرسی اور ظالم کے ہاتھ پکڑنے کے لیے ان کے شوہر نعمانی صاحب گھر پر نہ بیٹھیں۔ بلکہ دوسروں کی اشک شوئی میں دردر بھٹکتے رہیں۔ ۱۹۶۳ء کے فساد میں مالیگاؤں کے مسلمان ایک ناگہانی قیامت سے گزر رہے تھے۔ سارا شہر چھاؤنی بنا ہوا تھا۔ گرفتاری اور زدوکوب کی یکساں کارروائی کی وجہ سے مولانا کے لیے آرام حرام اور زندگی اجیرن بن چکی تھی۔ شہر کے تباہ حال مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لے کر تھکے ہارے اور پسینہ میں شرابور کرفیو کے دوران معہد ملت تشریف لائے۔ ابھی کرسی پر بیٹھے بھی نہ تھے کہ مولانا کی بیوی نے بعض مسلم علاقوں میں مسلمانوں اور عورتوں کے ساتھ ہونے والی درد بھری کہانی

سنائی ۔مولانا کا دل بھر آیا۔دو پہر کا کھانا حرام ہوگیا اور اسی وقت اُلٹے پیر گاڑی سے جائے حادثہ پر پہنچے ۔حالات کا جائزہ لیا اور اس وقت کے ڈی وائے ایس پی کلکرنی کو ٹیلی فون پر پولس کی یک طرفہ کارروائی اور بے جا زیادتی کے خلاف سخت ایکشن لیا۔حُسن اتفاق کہ مولانا کے ساتھ اس وقت میں بھی تھا۔

مولانا کی اہلیہ ہر چند کہ دوسروں کے دکھ درد کا خود مداوا نہیں کر سکتی تھیں ،تاہم اپنے شوہر کے ذریعے وہ قوم کے غم وآلام میں پورے طور پر شریک ہو کر اسے دور بھی کرتی تھیں جوایک اچھی حسّاس اور دردمند خاتون اور مادرِ ملت ہونے کی دلیل ہے ۔یہی نہیں ان کی وفاشعاری نے اپنے شوہر کو نازک ترین حالات میں بھی نہ چھوڑا بلکہ عمر بھر شوہر کی خوشیوں اوران کی مرضیات پر قربان ہو کر ایک قابل تقلید مشرقی خاتون کا ازدواجی اور مذہبی فرض ادا کرتی رہیں ۔مولانا کی راحت رسانی میں ضعفِ پیری کے باوجود اپنے غم اور اپنی تکلیف میں اضافہ کرتے رہنا مادرِ ملت کا امتیازی وصف بن چکا تھا۔ان کا دامنِ حیات خود غرضی سے پاک اورشوہر کی خدمت اور راحت رسانی کے جذبے سے معمور تھا۔

خاتون بیگم اگرچہ ناخواندہ اور تعلیم سے نابلد تھیں لیکن مولانا کی رُفاقت نے خصوصاً عورتوں کے دینی مسائل اور اسلامی تربیت کے لیے دل بینا اور دانا وشنوا عطا کیا تھا۔زندگی کے عہد شباب میں وہ شوہر کی طرح اس بات کے لیے ہر وقت کوشاں رہیں کہ مسلم بچّے اور بچّیاں کم سے کم قرآن کریم کی تعلیم سے واقف ہو جائیں ۔انہوں نے محلہ میں کئی جگہ اس کام کو مشن بنا کر شروع کیا اور دین سے واقف عورتوں کو ترغیب اور معاوضہ دے کر اس کام کے لیے مامور بھی کیا۔ خود ان کا مکان قرآن اور دینی تعلیم کا روزِ اول سے مرکز رہا ہے،اور آج بھی ہفتہ میں ایک روز ان کے مکان میں اجتماع ہوتا ہے اور اطراف کی عورتیں جمع ہو کر فیض یاب ہوتی ہیں ۔

عہد پیری میں ’’مدرسۃ البنات‘‘ کا قیام مرحومہ ہی کی خصوصی توجہ کا ثمرہ ہے ۔یہ مدرسہ اسی مکان میں شروع ہوا جہاں پہلے بیداری پریس تھا۔اب خدا کے فضل سے یہ مدرسہ بڑے

پیمانے پر دینی تعلیم کی نشر و اشاعت میں سر گرم ہے۔ جامعۃ الصالحات مالیگاؤں کے قیام کے بعد مرحومہ کی خواہش پر مدرسۃ البنات کے ذمہ داروں نے اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے بچّیوں کو وہاں داخل کیا اور کچھ بچّیاں وہاں سے فارغ ہوئیں اور آج بھی کچھ طالبات جامعہ میں زیر تعلیم ہیں۔ مدرسۃ البنات مولانا کی اہلیہ کی توجہ سے نہ صرف یہ کہ قائم ہوا بلکہ انہوں نے اس کی ترقی، معلمات کی تنخواہ اور ضروریات علم کی فراہمی کے لیے غیر معمولی کوشش بھی کی اور یہ سرچشمۂ علم بچیوں اور خواتین کو تعلیم سے سیراب کرنے میں مصروف ہے۔ بلاشبہ یہ سب کچھ مولانا نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی انقلابی تحریک اور فکر سلیم کی برکت ہے۔ آج سے ۱۴ رسال پہلے جب مولانا نے ''ادارہ امتحان دینیات'' قائم، فرمایا تو خاتون بیگم نے اسے مشن بنا کر عورتوں میں عام کیا۔ سینکڑوں بچیاں انہی کی ترغیب پر امتحان میں شریک ہوئیں اور دوسری بچّیوں کے لیے دینی تعلیم کی نشر و اشاعت کا باعث بننے لگیں۔

مولانا نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس بات کا شدّت سے احساس تھا بلکہ بعض مرتبہ برملا اپنی اہلیہ کے سامنے اظہار کرتے تھے کہ میں نے آپ کے ساتھ حق تلفی کی ہے اور قومی، ملی، دینی کاموں کے سامنے حقوق کی طرف سے کوتاہی بھی ہوتی رہی ہے۔

ایک مرتبہ ازراہِ دل لگی میری موجودگی میں فرمایا کہ مولوی حنیف صاحب! اگر خاتون کبھی حقوق کی طرف سے ہونے والی حق تلفی کا خدا کے یہاں دعویٰ کرے گی تو سوائے پشیمانی اور ندامت کے کچھ نہ ہوگا۔ اس پر مولانا کی اہلیہ نے اپنی مادری پوربی زبان میں کہا کہ یہ سب تو قوم کے لیے ہوا ہے جس کا صلہ تو مجھے ملنے والا ہے۔ پھر اس کا کیا غم ہے کہ میرے ساتھ حق تلفی ہوئی ہے میں تو اسے یہیں ختم کر رہی ہوں۔ اس پر مولانا نے تبسم زیر لب مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ اس کے لیے گواہ رہیے۔

۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ ملک کے مسلمانوں کے لیے نہ صرف بدترین آزمائش بلکہ بڑی قیامت ثابت ہوئی۔ ملک کے لیے وفاداری کے ہر محاذ پر کامیاب ہونے والی ملّت

بے وفا اور غدّار بنی ہوئی تھی، پورے ملک میں ڈی آئی آر کے تحت مسلمانوں کی گرفتاریاں ہو رہی تھیں۔ مالی گاؤں کے قیدیوں میں مولانا کا نام سرفہرست تھا۔ مولانا کی گرفتاری بڑے ڈرامائی انداز میں ہوئی۔

یہ حادثہ مولانا نعمانی صاحب کی ناتواں اور عمر دراز اہلیہ کے لیے بڑی آزمائش تھی۔ گرفتاری کے وقت اہلیہ کا متاثر ہونا، آنسو بہانا اور بے چینی کا اظہار کرنا، فطرت کا تقاضہ تھا، بزدلی اور کم ہمتی نہیں تھی۔ بلکہ مرحومہ نے مولانا آزاد کی بیوی اور بیگمِ حسرت موہانی کی طرح بڑی پامردی کا ثبوت دے کر خواتین اور گھر کی عورتوں کی ڈھارس باندھی۔ اہلیہ فرماتی تھیں کہ میرے کمزور اور لاغر شوہر کو گرفتار کر کے رسوائی، ذلت اور شرمندگی کے سوا کیا ملنے والا ہے۔ مولانا سے جیل میں ملاقات کے لیے جانے والوں سے کہتی تھیں کہ مولانا کو سلام اور گھر کی خیریت کے بعد کہہ دینا کہ اپنی فکر کیجئے۔ مالیگاؤں کے مسلمانوں کا خدا حافظ ہے۔ ان شاء اللہ آپ کی قید و بند رنگ لا کر رہے گی۔ خاتون مرحومہ کی ہمّت تھی کہ صبر وشکیب اور استقلال کے ساتھ انہوں نے اکّیس دن اسی مجبوری اور شوہر سے دوری میں گزار دیا۔ لیکن صبر میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ تصنیف و تالیف کے دوران مرحومہ حتی الامکان آرام پہنچانے کی کوشش کرتی رہیں۔ ضعفِ پیری کے ساتھ بیماری نے بھی آ گھیرا اور ہر وقت آرام کی فکر کرنے والی خاتون جب رخصت ہوئیں تو مولانا کو ان کی خدمت کی بڑی ضرورت تھی۔ مولانا کی عزیمت تھی کہ اس حادثہ کو برداشت کر گئے اور زبان پر شکوہ و اضطراب نہیں آنے دیا۔

ماخوذ: نقوش نعمانی، مصنف: شیخ الحدیث مولانا محمد حنیف ملی قاسمی، ناشر: مولانا جاوید احمد ملی، مطبوعہ: دسمبر ۱۹۹۷ء

☆......☆......☆

حضرت مولانا ابو الکلام آزادؒ[1] کی بیوی

(۲) محترمہ زلیخا بیگم

امام الہند حضرت مولانا ابو الکلام آزادؔ کی گھریلو زندگی کے حالات سے خواص بھی بہت کم واقف ہیں۔ ان کی افتادِ طبع ہی کچھ ایسی تھی کہ ان کی خلوتوں تک میں کسی کا گزرنا دشوار بہت تھا۔ تاہم یہ بڑی ناانصافی ہوگی اگر اس نیک نفس، مسکین مزاج، شریف و پاکباز، پیکر صبر و رضا پردہ نشین بیگم حضرت مولانا آزاد کے تذکرے سے تاریخ کے اوراق خالی رہیں جو گھریلو زندگی کی صحیح معنی میں رفیقۂ حیات تھیں۔ ان کی پاکیزگیٔ خیالات کا یہ عالم تھا کبھی ٹیلیفون کا ریسور اس لیے نہیں اٹھاتی تھیں نہ جانے دوسری طرف کون اور کون سا آدمی بات کر رہا ہے، اُس زمانہ میں ایسی عفت مآب خواتین کا خیال بھی نہیں آسکتا تھا بے شک کیسے آئے جب جو بی بی جتنی بیباک، شوخ دیدہ ہو اسی قدر معزز اور بلند خیال سمجھی جاتی تھی۔ یہ ٹیلی فون کرنے سے شرمانے والی خاتون آپ سمجھتے ہیں کون تھیں کوئی اَن پڑھ دیہاتن نہیں، خوب پڑھی لکھی اور ہندوستان کے سب سے زیادہ تعلیم یافتہ انسان کی رفیقۂ حیات بیگمِ امام الہند حضرت مولانا ابو الکلام آزادؔ زلیخا بیگم تھیں۔ ہندوستان کی جن عورتوں نے ان کو دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ مشرقی حیا آمیز اداؤں کا قافلہ اپنے جلوے میں لیے ایک حور پیکر جو یوسفِ ہندی حضرت مولانا ابو الکلام آزادؔ کی رفیقۂ حیات بن گئی تھیں۔

نرگسی آنکھیں دراز پلکیں، جٹی بھویں، پگھلے ہوئے سونے کا سا رنگ، بیضوی چہرہ، یاقوتی لب، ساون کی گھٹاؤں کے مانند کالے لمبے بال، بوٹا سا قدر، مائل بہ گداز دل آویز جسم

(۱) مولانا آزاد کا اصل اور مکمل نام محی الدین احمد ابن مولانا محمد خیر الدین کنیت ابو الکلام اور آزاد تخلص ہے۔ تاریخ و جائے پیدائش: ۱۱/نومبر ۱۸۸۸ء مکہ معظمہ، وفات: ۲۲/فروری ۱۹۵۸ء، مقام وفات: دہلی، مدفن: نزد جامع مسجد دہلی۔

سفید کالی کنی کی سوتی باریک ساڑھی، بے پرواہی سے لپیٹے اور وہ تمام خوبیاں جو ایک اچھی خاتون میں ہونا ضروری ہیں، سلیقہ شعاری میں طاق، مہمان نوازی میں یکتا، شیریں زبانی میں وحید، ادب واخلاق کی نادر مثال، مجموعہ اوصاف ومحاسن تھیں۔

امام الہند حضرت مولانا آزاد کی شادی جب ہوئی تو وہ بارہ سال کے تھے اور ان کی زوجہ زلیخا بیگم چھ سال کی ننھی منی بچی تھیں۔ ان کے والد آفتاب الدین صاحب بغداد کے ایک شریف خاندان کے چشم وچراغ تھے ان کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جا کر ملتا ہے۔ آفتاب الدین صاحب مولانا آزادؔ کے والد کے خاص مریدوں میں سے تھے۔ زلیخا بیگم ان کی پانچویں صاجزادی تھیں۔ ان کے یہاں پیدا ہوئیں تو انہوں نے پیر ومرشد کے قدموں میں لاکر ڈال دیا تھا انہوں نے اس حسین پیاری بچی کو گود میں لیا اور اس کا نام زلیخا رکھا۔ چھ سال کی عمر میں نکاح ہوا۔ ان کے ننھے سے دل پر اسی وقت سے اپنے یوسف جمال شوہر کا قبضہ ہوگیا اور شباب کی منزل میں قدم رکھتے ہی وہ اپنے عظیم الشان شوہر کی پرستش کرنے لگیں۔ آپ کے ہر خیال کو انہوں نے اپنے سر آنکھوں پر رکھا۔ ہجر کی سختیاں بھی سہیں اور مالی مشکلات بھی برداشت کیں مگر لب پر کبھی اُف تک نہ لائیں، حضرت مولانا آزاد کے سیاسی معاملات میں حصہ لینے کی وجہ سے مالی حالت کبھی اچھی نہیں رہی اگر ان کو اتنی مہلت ملتی کہ وہ صرف ادبی کام کرتے تو یقیناً دولت کی دیوی ان کے قدموں کو چومتی ان کو ان کا احساس دل نچلا نہ بیٹھنے دیتا تھا انہیں پسماندہ قوم اور غلام ملک کا غم چین نہ لینے دیتا تھا ان کی شعلہ نفسی اور آتش بیانی قلمِ زبان سے دلوں کو گرماتی رہتی اور ان کی رفیقۂ حیات نہ اچھا کھاتیں اور نہ اچھا پہنتیں۔ ان تمام تکالیف کو سکون واطمینان سے برداشت کرتی تھیں جو شوہر کی جدائی اور مالی پریشانیوں کی وجہ سے ان پر گزرتیں۔ زلیخا بیگم کا زیادہ وقت یادِ الٰہی اور حضرت مولانا آزاد کے لیے کامیابی کی دعاؤں میں گزرتا تھا۔ ہر وقت کڑھتے رہنے کی وجہ سے ان کی صحت گرگئی تھی مگر یہ اپنی دھن میں مگن رہتیں۔ اپنی خرابی صحت کا ذکر کبھی حضرت مولانا آزاد سے نہیں کیا جس وقت

بھی اور جتنے دن بھی وہ گھر پر رہتے یہ پاک بیوی مسکراتی ہوئی ہمہ تن شوق ہو کر ان کا استقبال کرتیں اور ہر طرح شوہر کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتیں تاکہ تھکا ہوا دماغ جس کو سیاسی گتھیاں سلجھانی ہوتیں اور مذہبی اور ادبی کام بھی کرنے پڑتے تھے۔ گھریلو فضا میں آرام پاکر اور زیادہ ہمت و شوق سے کام کر سکیں اور حضرت مولانا آزاد اس پیکرِ صبر کی بدولت ہر مرتبہ نیا ولولہ اور جوش لے کر جنگِ آزادی کے لیے تیار ہو جائیں۔

حمیدہ سلطانہ جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو صوبہ دہلی کی والدۂ محترمہ اور خود ان کے حضرت مولانا آزاد کی بیگم سے دیرینہ تعلقات تھے۔ ان کے گھر پر ان کا اور ان کی والدہ ماجدہ کا آنا جانا تھا، چنانچہ حمیدہ سلطانہ صاحبہ کا ایک مضمون رسالہ صبح دہلی کے آزادی نمبر میں "بیگم آزاد اور زلیخا" کے عنوان سے چھپا تھا۔ اس میں زلیخا کی ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے۔

میری عمر سات یا آٹھ سال کی تھی، دہلی میں ایک زنانہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت بیگم بھوپال سلطان جہاں بیگم نے کی۔ ان کے ہمراہ مولانا آزاد کی دونوں بہنیں آبرو بیگم صاحبہ اور فاطمہ بیگم صاحبہ بھی تشریف لائیں۔ ان دونوں کے علم و فضل اور ادیبانہ خطبوں کی دھاک پڑھی لکھی خواتین پر بیٹھی ہوئی تھی چونکہ والدہ صاحبہ اس کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کی ایک رکن تھیں ان کی میزبانی کا شرف ہمارے گھر کو ملا۔ اس طرح دوستی کی بنیاد پڑی۔ پھر یہ مراسم دن بدن بڑھتے چلے گئے۔ ۱۹۳۲ء میں ابا جان کی وفات کے بعد تین سال ہمارا کلکتہ رہنا ہوا تو تعلقات بالکل عزیزانہ ہو گئے۔ یہ دونوں اپنے مکرم بھائی سے ملنے بھوپال آئیں تو ہمارے یہاں بھی آئیں۔ پھر اپنی چہیتی بھاوج زلیخا بیگمِ آزاد سے والدہ صاحبہ کو ملوایا، مولانا آزاد بالی گنج کی ایک شاندار عمارت میں رہتے تھے۔ والدہ صاحبہ پرانے زمانہ کی بہت رکھ رکھاؤ والی عورت تھیں مگر ادھر بیگم آزاد کی پاکیزہ صورت اور دلنشیں اداؤں نے ان کو کھینچا۔ ادھر شرمیلی اور کم آمیز ہونے کے باوجود ایسی گھل مل گئیں کہ بلاناغہ ایک ہفتہ وہاں جاتیں۔ دوسرے ہفتے وہ یہاں آتیں۔ ان میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک اچھی خاتون میں ہونی ضروری ہیں۔ وہ

سسرال والوں پر جان چھڑکتی تھیں اور شوہر پر بھی فدا تھیں۔

ایک مرتبہ صبح دس بجے کے بعد یہ ان کے یہاں پہنچیں تو خلاف عادت اس دن پندرہ منٹ کے بعد مسکراتی ہوئی آئیں اور مسکراتے ہوئے کہا معاف کیجئے گا بہن آپ کو اتنا میرا انتظار کرنا پڑا۔ مولانا کو کھانا کھلا رہی تھی وہ تھوڑا سا کھانا کھاتے ہیں۔ دو چمچے اُبلے ہوئے چاول، تھوڑی سی دال، سبزی یا گوشت اور دہی چونکہ صبح بہت سویرے اٹھ جاتے ہیں اس لیے دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد بارہ بجے سے پہلے لیٹ جاتے ہیں۔ پھر دو بجے غسل کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد کاموں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ملنے والوں کا تانتا رات گئے تک لگا رہتا ہے۔ بیگم آزاد کے بکھرے بالوں کی طرف اشارہ کر کے بولیں بھاوج معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بھائی کو آپ کی زلف پریشاں بہت پسند ہے جو آپ سر نہیں گوندھتیں۔ وہ انداز سے لجا کر بولیں اے نہیں بہن یہ بات نہیں ان کے بار بار جیل جانے سے میری طبیعت کچھ ایسی خفقانی ہو گئی ہے کہ چوٹی گوندھنے سے دل گھبراتا ہے وہ اندازِ حجاب بھی مجھے یاد ہے کہ کیسی باحیا بیوی تھیں اور کیا زمانہ تھا کہ شوہر کا ذکر کرتے ہوئے بھی شرماتی تھیں۔ میں اس دن ان پر تنقید کرنے کی ٹھان کے گئی تھی۔ پھر ان کی خالی کلائیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا ہائے نوج ایسی بھی کیا سادگی، وہم نہیں آتا۔ اللہ تمہارا سہاگ قائم رکھے۔ ایک چوڑی ہاتھ میں ڈال لیا کرو۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا آخر ہیں نا آپ بھی نند، بالکل سسرال والوں کی طرح طعنے دے رہی ہیں۔ اچھا آئندہ آپ کی خوشی کا خیال رکھوں گی۔

ایک دن صبح کو ہم جو پہنچے تو بیگم آزاد کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے دیکھ کر والدہ صاحبہ نے مسکرا کر کہا کیا رتجگہ کیا ہے بھاوج؟ آنکھیں گلابی ہو رہی ہیں۔ وہ ہنس کر بولیں آپ کی تو عادت ہی بنانے کی آج کل مولانا قرآن پاک کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ رات کو دو بجے کے بعد اٹھ بیٹھتے ہیں جتنی دیر وہ لکھتے ہیں پنکھا جھلتی ہوں۔ موسم بہت گرم ہے باہر بھی حبس رہتا ہے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے وہ جاگیں، محنت کریں اور میں آرام سے سوتی رہوں۔ یہی تھا اس نیک بی بی

کا جذبہ جس کو یاد کر کے مرنے والی کے غم میں حضرت مولانا آزاد پر احمد نگر قلعہ میں ایک پرانی قبر کو دیکھ کر رقت طاری ہو جاتی تھی، نہ صرف یہ کہ وہ حسین وجمیل واطاعت گزار وفا شعار تھیں بلکہ خود بھی عالمہ اور فاضلہ اور حضرت مولانا آزاد کی طرح کثرت مطالعہ کی دلدادہ تھیں۔ دن رات مطالعہ سے شغف رکھتی تھیں۔ بے حد نڈر، دلیر اور جری خاتون تھیں۔ عزم واستقامت، استقلال اور پامردی میں کسی سے کم نہ تھیں جس کا ثبوت اس خط سے ملتا ہے جو انہوں نے ۱۹۲۲ء میں گاندھی جی کے نام اس تاریخی مقدمہ کے فیصلہ کی اطلاع دینے کے لیے لکھا تھا جو بغاوت کے جُرم میں حضرت مولانا آزاد کے خلاف کلکتہ کی ایک عدالت میں چلا گیا تھا اور جس میں حضرت مولانا آزادؔ نے وہ یادگار بیان دیا تھا جو قانون، انصاف، آزادی اور ادب کی تاریخ میں ''قول فیصل'' کے نام سے محفوظ رہے گا۔ اس مقدمہ میں حضرت مولانا آزاد کو ایک برس کی سزائے قید ہوئی تھی۔

''میرے شوہر مولانا ابوالکلام آزاد کے مقدمہ کا فیصلہ آج سنا دیا گیا انہیں صرف ایک سال قید سخت کی سزا دی گئی ہے یہ نہایت تعجب انگیز طور پر اس سے بدرجہا کم ہے جس کے لیے ہم تیار تھے اگر سزا اور قید قومی خدمات کا معاوضہ ہے تو آپ تسلیم کریں گے کہ اس معاملہ میں بھی ان کے ساتھ ناانصافی برتی گئی یہ کم سے کم بھی نہیں ہے۔ جس کے وہ مستحق تھے۔ آگے چل کر وہ فرماتی ہیں۔ میں پہلے چار سال تک نظر بندی کے زمانہ میں اپنی ایک آزمائش کر چکی ہوں اور میں کہہ سکتی ہوں کہ اس دوسری آزمائش میں بھی پوری اتروں گی۔ گذشتہ پانچ سال سے میری صحت نہایت کمزور ہوگئی۔ دماغی محنت سے بالکل مجبور ہوں اس لیے باوجود میری خواہش کے مولانا اس سے مانع رہے کہ کسی طرح کی محنت اور مشغولیت کے کام میں حصہ لوں لیکن میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ ان کی سزایابی کے بعد مجھے اپنی ناچیز ہستی کو ادائے فرض کے لیے وقف کر دینا چاہیے میں آج سے بنگال صوبائی خلافت کمیٹی کے تمام کاموں کو اپنے بھائی کی اعانت سے انجام دوں گی۔''

جب ۱۹۴۲ء میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو احمد نگر قلعہ میں نظر بند کیا گیا تو اس وقت زلیخا بیگم کی طبیعت خراب تھی۔ ان دنوں برٹش حکومت کا سخت رویہ ہو رہا تھا اور صورت حال بہت تشویش ناک ہو رہی تھی کسی کو معلوم نہ تھا کہ ان لوگوں کو کہاں رکھا گیا ہے۔ تمام ہندوستان میں نظر بندوں کے متعلق متضاد افواہیں مشہور ہو رہی تھیں اور بھانت بھانت کی بولیاں ستم رسیدہ فرقت کی ماری بیگمِ آزاد کے دل پر تیر و نشتر کا کام کرتی تھیں۔ اپنے چہیتے شوہر کے متعلق ہر نئی خبر سن کر تڑپ کر رہ جاتی تھیں۔ ان کو بس دن رات حضرت مولانا کی سلامتی کی دعائیں مانگنے اور رونے کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ دوا انہوں نے بالکل چھوڑ دی تھی۔ غذا بھی برائے نام تھی۔ دق کا نامراد موذی مرض دو سال سے پیچھے کیے ہوئے تھا۔ اب کمزور جسم پر اس نے بالکل تسلط جما لیا تھا۔ ڈاکٹر بی سی رائے اور کلکتہ کے مشہور ڈاکٹروں نے دیکھا مگر مرض کو افاقہ کیسے ہوتا۔ دوا تھی نہ غذا وہ ہر ایک معالج سے یہی کہتی تھیں کہ بس خدا کے لیے مجھے ایک مرتبہ مولانا کو دکھا دو۔ ان کی حالت کو دیکھ کر اور التجائیں سن کر آنکھوں میں آنسو بھرے ہر ڈاکٹر چارپائی سے اٹھتا تھا۔ آخر بقولِ حضرت مولانا آزاد ۱۹/اپریل ۱۹۴۳ء کو زہر غم کا پیالہ لبریز ہو گیا۔ زلیخا بیگم اپنے محبوب شوہر کی دید ار حسرت لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں، جسد بے جان سپرد خاک کر دیا گیا اور روح شاید جسم سے آزاد ہو کر بھی اپنے یوسف کے گرد پھرتی رہی ہو گی۔

حضرت مولانا آزاد نے غبار خاطر والا خط جو نواب یار جنگ کے نام لکھا تھا جس میں انہوں نے اس سانحہ کا ذکر کیا تھا وہ اس مضمون کے آخر میں درج ہو گا۔ غم گسار شمع صفت بیوی کے انتقال کے بعد حضرت مولانا کی زندگی کے معمولات میں تو بظاہر فرق نہیں آیا۔ لیکن ان کا دل ہل گیا تھا۔ اس جانگداز غم کے زیر اثر انہوں نے غبار خاطر کے ایک خط میں اپنے آپ کو شاخ بریدہ سے تشبیہ دی ہے جس کو موسم بہار کی جانفزا ہوائیں بھی تازگی نہیں بخش سکیں۔ اپنے غم زدہ دل کو تھام کر بے اختیار فرماتے ہیں۔

شاخِ بریدہ را نظرے بر بہار نیست

اور ان کا دلی حزن اس سے واضح ہو جاتا ہے، رہا ہونے کے بعد جب اپنی زلیخا کی آرام گاہ پر گئے تو باوجود بے انتہا ضبط و تحمل کے جو ان کی طبیعت کی خاص خصوصیت تھی اپنی چاہنے والی کی مرقد پر آنسوؤں کے موتی نچھاور کیے بغیر نہ رہ سکے۔ وفورِ رقت کو تھامنا ان کے بس میں نہ رہا اور بہت دیر تک سر جھکائے روتے رہے۔

اللہ تعالیٰ نے جہاں انہیں اور بہت سی نوازشوں سے نوازا تھا وہیں ایسی باوفا نیک طینت و پاک صورت بیوی عطا فرمائی تھی۔ زلیخا بیگم کی ذات پر عالم نسواں جتنا فخر کرے بجا ہے۔ حسن و جمال کی آغوش میں آنکھ کھولی جیسی معصومیت اور تقدس بیگم آزاد کی صورت میں تھا وہ حقیقتاً اس دنیائے آب و گل کی رہنے والی ہستی نہیں بلکہ آسمانی مخلوق معلوم ہوتی تھیں۔

امام الہند حضرت مولانا آزاد کی صحت بیوی کی وفات کے بعد دن بدن خراب ہوتی گئی اور مزاج کی شگفتگی بہت کم ہو گئی تھی وہ بذلہ سنجیاں جو ان کے مخصوص احباب کی محفلوں کو کشت زعفران بنا دیتی تھیں برائے نام رہ گئی تھیں۔ وہ ہر وقت کھوئے کھوئے سے رہنے لگے تھے۔ زلیخا بیگم کی زندگی میں ان کو غالباً یہ احساس نہ تھا کہ اس باوفا بیوی سے خود ان کو بھی لگاؤ ہے لیکن مرنے والی کے بعد جیسے ان کی زندگی میں کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا اپنی زندگی کی یہ متاع عزیز بھی ملک و قوم پر نچھاور کر چکے تھے۔ اس خدا کی بھری ہوئی دنیا میں ان کے لیے کاموں اور ان کی یاد کے علاوہ کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

حمیدہ صاحبہ لکھتی ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اکثر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا کرتی تھیں، جب بھی حاضر ہوتی وہ مجھ پر شفقت فرماتے تھے ایک مرتبہ دورانِ گفتگو زلیخا بیگم کا ذکر میں نے کر دیا۔ مولانا صاحب ایک دم اس طرح خاموش ہو گئے گویا اس ذکر نے ان کے دل پر نشتر لگا دیا، وہ بہت دیر تک سرنگوں خاموش بیٹھے رہے، میں دم بخود پریشان سی بیٹھی رہی، ان کی جانکاہ غم کا اندازہ کر رہی تھی۔ آخر طویل زمانہ کے بعد ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کی آدھی رات ختم

ہوگئی اور مولانا صاحب کی مقدس روح اپنی زلیخا کی تلاش میں عالم جاوداں کو سدھار گئی۔
امام الہند حضرت مولانا آزاد کے پرائیوٹ سکریٹری جناب اجمل خان بھی حضرت مولانا آزاد کی آخری زندگی کے بارے میں یہی رائے رکھتے تھے۔

”ان کی گھریلو زندگی میں بیگم صاحبہ کی وفات نے ایک خلا پیدا کر دیا تھا جس کا پُر ہونا محال تھا۔ان کی وفات کے بعد سے وہ صرف اپنے دماغ کے بھروسے پر زندہ تھے اگر ہنستے بھی تھے تو اوپری دل سے اور خاموش رہتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گہری فکر میں ہیں جس میں غم ملا ہوا ہے۔“

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم
ہو غم ہی جانگداز تو غم خوار کیا کرے

اس عظیم المرتبت زلیخا بیگم کے انتقال پر حیرت نہ ہونی چاہیے کہ مسلم لیگ جو حضرت مولانا آزاد کے سیاسی نظریات سے سخت نالاں تھی لیکن وہ بھی برطانوی حکومت کے اس جبر کو ضبط نہ کرسکی کہ اس نے اس عالم میں حضرت مولانا آزاد کو غیر مشروط رہائی نہ دی تا کہ وہ اپنی چہیتی بیگم کا آخری دیدار کرتے اور تجہیز و تکفین میں شریک ہوسکتے۔ چنانچہ پورے ملک میں اس المناک موت پر ماتم کیا گیا اور ۱۷ اپریل ۱۹۴۳ء کو جناب عبدالرحمن صاحب کے زیر اہتمام کلکتہ میں مسلم لیگ کا ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس میں جناب شہید سہروردی، جناب مولانا عبدالجبار دہلوی، راغب حسن، جناب ابوالہاشم اور مسلم لیگ کے بعض دوسرے عمائدین نے شرکت کی۔اس جلسہ میں جناب اسماعیل ہوش نے ایک تعزیتی نظم بھی پڑھی تھی جس کا اثر یہ ہوا تھا کہ سامعین کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئی تھیں۔ اس نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

اے زمیں حق ہے اگر تو اپنے سر پر خاک اڑائے
اے فلک حق ہے اگر تو خون کے آنسو بہائے

حق ہو گیتی پر جو چھائیں یاس کی تاریکیاں
حق ہے دنیا میں اگر شمع حسرت جھلملائے

آج تک دیکھا نہ ہوگا، عالم ایجاد نے
جان دی جس بے کسی میں بیگم آزاد نے

آؤ اے مرغان گلشن اشک افشانی کریں
آؤ اے صحرا کے زرو! مرثیہ خوانی کریں

آؤ اے اہل وطن سب مل کے جو ماتم گسار
آؤ ہم رو رو کے اپنے خون کو پانی کریں

باغ پر آئے خزاں ، اور باغباں ہو قید میں
کارواں لٹ جائے، امیر کارواں ہو قید میں

اس کی بیگم جان دے اور وہ سر بالیں نہ ہو
یا خدا ایسی کسی کی موت غم آگیں نہ ہو

مرتے دم بھی اپنے بیگانوں سے جو ملنے نہ دے
یوں کسی مملکت میں جبر کا آئیں نہ ہو

آہ وہ آنکھیں جو حسرت لے گئیں دیدار کی
یہ بھی اک طرز عنایت تھی میرے سرکار کی

ایسی موتیں ہوتی ہیں ' سرمایہ نقش دوام
تاابد باقی رہے گا، ہوش مرحومہ کا نام

جب مرتب ہوگی مستقبل میں تاریخ وطن
حرف خونیں سے رقم ہوگا یہ قصہ لاکلام

انقلاب ایسا بھی ہونے کو ہے زیر آسماں
ظلم خود دہرائے گا ، صبر ورضا کی داستاں

جو خاتون اتنی اعلیٰ صفات کی حامل ہواور اتنے معروف عظیم الشان کی رفیقۂ حیات بھی ہواس کی پردہ نشینی، شرم وحیااور اطاعت شوہر کی مبنی پر حقائق باتیں اس بیسویں صدی میں بڑی حیرت ناک معلوم ہوتی ہیں اور اگر ملک کے مشہور ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی اس معزز خاتون کی ان باتوں پر حیرت ظاہر کریں تو ان کا قول بجا ہے۔

''اللہ اللہ ایک اتنے بڑے پبلک لیڈر کی بیوی کے لیے اس بیسویں صدی میں پردہ نشیں رہنا خود کیا جرم تھا چہ جائیکہ اپنا وقت بجائے کلب، بال روم، اور سنیما ہال میں صرف کرنے کے، اگلی جنتی بیویوں کی طرح شوہر کا کھانا کھلانا، پنکھا جھلنا، ان کے خیال سے راتوں کو خود اپنی نیند خراب کرنا، ٹیلی فون کو شوقیہ استعمال کرتے رہنے کے بجائے نامحرم کے خیال سے اس کے سننے سے بھی احتیاط کرنا اور کمال یہ کہ شوہر کا نام لینے سے شرمانا ایسی بی بی کو حق کیا تھا آزادی اور بیباکی کی اس فضا میں زیادہ جیتے رہنے کا؟ اچھا ہی ہوا جو وہ جلد ہی جنت کے سفر پر روانہ ہوگئیں۔

حضرت مولانا آزاد احمد نگر کے قلعہ میں نظر بندی کے دن گزار رہے تھے۔ ایک سخت امتحان کا وقت آیا۔ ان کی اہلیہ زلیخہ بیگم سخت بیمار پڑیں۔ حکومت کو بھی معلوم ہوا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل حضرت مولانا آزاد کے پاس آیا اس نے ہمدردی کا اظہار کیا اور درخواست کی کہ اگر آپ پیرول پر رہا ہونا چاہتے ہیں تو درخواست دے دیجئے۔ حکومت کو بھیج دی جائے گی۔ یہ بات آپ کی خودداری کے خلاف تھی۔ آپ حکومت سے کوئی درخواست کرنی نہیں چاہتے تھے۔ جواہر لال جی نے بھی آپ کو اس سلسلہ میں مشورہ دیا۔ آپ نے ان سے بھی اپنے انہی خیالات کا اظہار کیا چنانچہ حضرت مولانا آزاد نے کوئی درخواست حکومت کو نہیں دی اس اثناء میں ان کی اہلیہ زلیخا بیگم کا انتقال ہوگیا۔ اس سانحہ پر حضرت امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک

تفصیلی خط مورخہ ۱۱/اپریل ۱۹۴۳ء کو تحریر فرمایا جو سبق آموز ہے ملک کی جنگ آزادی کے لیے لوگوں نے کیسی کیسی قربانیاں دی ہیں جس کا یہ صلہ ملا ہے کہ ایک خاندان ہندوستان کی حکومت کو اپنی میراث سمجھتا ہے اپنے اس اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے جمہوریت و آزاد خیالی کا خاتمہ کیا اور ڈکٹیٹر شپ قائم کی ہندوستانی لوگوں کے حقوق کو پامال کر کے ایمرجنسی عائد کی۔ لاائینڈ آرڈر کا قلع قمع کیا، ہندوستانیوں کی جان و مال محفوظ نہیں ہے فرقہ پرستی شباب پر ہے۔ حضرت مولانا آزاد کے اس خط کو پڑھیے اور سر دھنیے۔

''اس وقت صبح کے چار بجے نہیں بلکہ رات کا پچھلا حصہ شروع ہو رہا ہے۔ دس بجے حسب معمول بستر پر لیٹ گیا تھا لیکن آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئیں ناچار اٹھ بیٹھا، کمرہ میں آیا روشنی کی اور اپنے اشغال میں ڈوب گیا۔ پھر خیال ہوا قلم اٹھاؤں اور کچھ دیر آپ سے باتیں کر کے جی کا بوجھ ہلکا کروں ان آٹھ مہینوں میں جو یہاں گزر چکے ہیں یہ چھٹی رات ہے جو اس طرح گزر رہی ہے اور نہیں معلوم ابھی اور کتنی راتیں اس طرح گزریں گی۔

دماغ بر فلک و دل بپائے مہر بتان
چہ گونہ حرف زنم، دل کجا، دماغ کجا

میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی ۱۹۴۱ء میں نینی تال میں مقید تھا تو اس خیال سے کہ میرے تشویش خاطر کا موجب ہوگا مجھے اطلاع نہیں دی گئی لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں گذرا تھا۔ مجھے قید خانہ میں ان کے خط ملتے رہے۔ ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں۔ لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہ ہوتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا تو ان سب کی رائے تبدیلی آب و ہوا کی ہوئی اور وہ رانچی چلی گئیں۔ رانچی کے قیام سے بہ ظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی میں واپس آئیں تو صحت کی رونق چہرے پر واپس آ رہی تھی۔ ان تمام زمانہ میں زیادہ تر سفر میں رہا وقت کے حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی ایک منزل میں ابھی

قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہوگئی۔ جولائی کی آخری تاریخ تھی کہ میں تین ہفتہ کے بعد کلکتہ واپس ہوا، اور پھر چار دن کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی کے لیے روانہ ہوگیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ابھی طوفان نہیں آیا تھا مگر طوفانی آثار ہر طرف امنڈ نے لگے تھے حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ایک افواہ خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کرلیا جائے گا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام میں بھیج دیا جائے گا۔ یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ لڑائی کے غیر معمولی حالات نے حکومت کو غیر معمولی اختیارات دے دیئے ہیں اور وہ ان سے ہر طرح کا کام لے سکتی ہے (گرفتاری کے بعد جو بیانات اخبارات میں آئے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ افواہیں بے اصل نہ تھیں۔ سکریٹری آف اسٹیٹ اور وائسرائے کی بھی یہی رائے تھی کہ ہمیں گرفتار کر کے مشرقی افریقہ بھیج دیا جائے اور اس غرض سے بعض انتظامات کر بھی لیے گئے تھے لیکن پھر رائے بدل گئی اور بالآخر طے پایا کہ قلعہ احمد نگر میں فوجی نگرانی کے ماتحت رکھا جائے اور ایسی سختیاں عمل میں لائی جائیں کہ ہندوستان سے باہر بھیجنے کا جو مقصد تھا وہ یہیں حل ہو جائے) ان حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا کی نظر رہا کرتی تھی اور اس نے وقت کے صورت حال پر پوری طرح اندازہ کرلیا تھا، ان چار دنوں کے اندر جو میں نے دو سفر کے درمیان بسر کیے ہیں اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع بہت کم ملا۔ وہ میری طبیعت کی اُفتاد سے واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں پسند نہیں کرتا تھا کہ اس خاموشی میں خلل پڑے اس لیے وہ بھی خاموش رہتی تھی لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سُن رہے تھے اور اس کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے ۳؍اگست کو جب میں بمبئی کے لیے روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لیے آئیں میں نے کہا اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا تو

۱۳/ اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا کچھ نہیں کہا لیکن اگر وہ کچھ اور کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا۔

گذشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو ان کی طبیعت پر غالب آ گئی تھی میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورت حال کا ایک مجہول سا احساس ہونے لگا تھا شاید وہ محسوس کر رہی تھیں کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے وہ خدا حافظ اس لیے نہیں کہہ رہی تھیں کہ وہ خود سفر کرنے والی ہے۔ وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طرح واقف تھیں وہ جانتی تھیں کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطراب کا اظہار ہو گیا تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا اور عرصہ تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی۔ ۱۹۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اپنا اضطراب خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصہ تک اُس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعہ نے ہمیشہ کے لیے ان کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ میرے زندگی کے حالات کا ساتھ دے اُس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوش گوار حالات برداشت کیے وہ دماغی حیثیت سے مرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار تھی ان کے اندرونی احساسات پر مستقل پرچھائیں پڑنا شروع ہو گئی تھی۔ گرفتاری کے بعد عزیزوں سے خط و کتابت کا موقع نہیں دیا گیا تھا پر جب یہ روک ہٹالی گئی تو ۷/ ستمبر کو مجھے ان کا پہلا خط ملا اور اس کے بعد برابر خط ملتے رہے۔ چوں کہ مجھ کو معلوم تھا کہ وہ اپنی بیماری کا حال لکھ کر مجھ کو پریشان خاطر کرنا پسند نہیں کرے گی۔ اس لیے گھر کے بعض دوسرے عزیزوں سے ان کے حالات دریافت کرتا رہتا تھا۔ خطوط یہاں عموماً تاریخ کتابت سے دس بارہ دن

بعد ملتے ہیں اس لیے کوئی بات جلد معلوم نہیں ہوسکتی۔ ۱۵رفروری کو مجھے ایک ۲رفروری کا بھیجا ہوا خط ملا۔جس میں لکھا ہوا تھا کہ ان کی طبیعت اچھی نہیں ہے میں نے تار کے ذریعے مزید صورت حال دریافت کی تو ایک ہفتہ کے بعد جواب ملا کہ تشویش کی بات نہیں ہے۔

۲۲رمارچ کو مجھے پہلی اطلاع ان کی خطرناک علالت کی ملی۔گورنمنٹ بمبئی نے ایک ٹیلی گراف کے ذریعہ سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع دی کہ اس مضمون کا ایک ٹیلی گرام اسے کلکتہ سے ملا ہے۔جو ٹیلی گرام گورنمنٹ بمبئی کو وہ کس تاریخ کا تھا اور کتنے دنوں کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے یہ خبر پہنچا دینی چاہیے چونکہ حکومت نے ہمارے قید کا محل اپنی دانشت میں پوشیدہ رکھا ہے۔ اس لیے ابتداء سے یہ طرز عمل اختیار کیا کہ نہ تو یہاں سے کوئی ٹیلی گرام باہر بھیجا جاسکتا ہے نہ باہر سے کوئی آسکتا ہے۔کیوں کہ اگر آئے گا تو ٹیلی گراف آفس ہی کے ذریعے آئے گا اور اس صورت میں آفس کے لوگوں پر راز کھل جائے گا اس پابندی کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بات کتنی ہی جلدی کی ہو لیکن تار کے ذریعے نہیں بھیجی جاسکتی اگر تار بھیجنا ہو تو اسے لکھ کر سپرنٹنڈنٹ کو دے دینا چاہیے،وہ اسی خط کے ذریعہ بمبئی بھیجے گا۔

وہاں سے احتساب کے بعد اسے آگے روانہ کیا جاسکتا ہے خط وکتابت کی نگرانی کے لحاظ سے یہاں قیدیوں کی دو قسمیں کر دی گئی ہیں بعض کے لیے صرف بمبئی کی نگرانی کافی سمجھی جاتی ہے،بعض کے لیے ضروری ہے کہ اُن کی نہ تمام ڈاک دہلی جائے اور جب تک وہاں سے منظوری نہ مل جائے آگے بڑھائی جائے۔چونکہ میری ڈاک دوسری قسم میں داخل ہے اس لیے مجھے کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے نہیں مل سکتا اور نہ کوئی میرا تار ایک ہفتہ پہلے کلکتہ پہنچ سکتا ہے۔ یہ تار ۲۳رمارچ کو یہاں پہنچا۔فوجی رمز میں لکھا گیا۔سپرنٹنڈنٹ اسے حل نہیں کرسکتا تھا۔وہ اسے فوجی ہیڈکوارٹر میں لے گیا۔وہاں اتفاق سے کوئی آدمی موجود نہ تھا اس لیے پورا دن اس کے حل کرنے کی کوشش میں نکل گیا۔رات کو اس کی حل شدہ کاپی مجھے مل سکی۔دوسرے دن اخبارات آئے تو ان میں بھی یہ معاملہ آچکا تھا معلوم ہوا کہ

ڈاکٹروں نے صورت حال کی حکومت کو اطلاع دے دی ہے اور جواب کے منتظر ہیں پھر بیماری کے متعلق معالجوں کی روزانہ اطلاعات نکلنے لگیں سپرنٹنڈنٹ روز ریڈیو میں سنتا تھا اور یہاں بعض رفقاء سے ان کا ذکر کر دیا کرتا تھا۔ جس دن تار ملا اس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ چاہتا ہوں تو وہ اسے فوراً بمبئی بھیج دے گا اور یہاں کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی۔ وہ صورت حال سے متاثر تھا اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے صاف کہہ دیا کہ حکومت سے کوئی درخواست کرنی نہیں چاہتا پھر وہ جواہر لال کے پاس گیا اور اس نے ان سے میرے بارے میں بات کی کہ وہ سہ پہر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے ان سے یہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا بعد میں معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومت بمبئی کی ایماء پر کہی تھی۔

جونہی خطرناک صورت حال کی خبر ملی میں نے دل کو ٹٹولنا شروع کر دیا انسان کے نفس کا کچھ عجیب حال ہے تمام عمر اس کی دیکھ بھال میں بسر کر دیتے ہیں پھر بھی یہ معمہ حل نہیں ہوتا۔ میری زندگی ابتداء سے ایسے حالات میں گزری کہ طبیعت کو ضبط و انقیاد میں لانے کے متواتر مواقع پیش آتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا ان سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی۔

تادست رسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لیے جدوجہد کرنی پڑے گی، یہ جدوجہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے۔ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔ اس زمانہ میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا۔ میں اسے چھپانا نہیں چاہتا میری کوشش تھی اس صورت حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کرلوں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہو گیا لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات و انفعالات کے ہر گوشہ میں کھیلا کرتے ہیں اور اپنے

ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے۔ سب سے پہلی کوشش یہ کرنی پڑی کہ یہاں کی زندگی کی جو روزانہ معمولات ٹھہرائی جا چکی ہیں، ان میں فرق نہ آنے پائے۔ چائے اور کھانے کے چار وقت ہیں جن میں مجھے اپنے کمرہ سے نکلنا اور کمروں کی قطار کے آخر کمرہ میں جانا پڑتا ہے چوں کہ زندگی کی معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حساب سے عادی ہو گیا ہوں۔ اس لیے یہاں بھی اوقات کی پابندی کی رسم قائم ہو گئی اور تمام ساتھیوں کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ میں نے ان دنوں میں اپنا معمول بدستور رکھا۔ ٹھیک وقت پر کمرہ سے نکلتا رہا اور کھانے کی میز پر بیٹھتا رہا۔ بھوک یک قلم بند ہو چکی ہے لیکن چند لقمے حلق سے اتارتا رہا۔ رات کو کھانے کے بعد کچھ دیر تک صحن میں چند ساتھیوں کے ساتھ نشست رہا کرتی تھی اس میں بھی کوئی فرق نہیں آیا جتنی دیر تک وہاں بیٹھتا تھا جس طرح باتیں کرتا تھا اور جس قسم کی باتیں کرتا تھا وہ سب کچھ بدستور کرتا رہا۔ اخبارات یہاں بارہ سے ایک بجے کے اندر آیا کرتے ہیں۔ میرے کمرے کے دوسری طرف سپرنٹنڈنٹ کا دفتر ہے۔ جیلر وہاں سے اخبار لے کر سیدھا میرے کمرہ میں آتا ہے جونہی اس کے دفتر سے نکلنے اور چلنے کی آہٹ آنا شروع ہوتی تھی دل دھڑکنے لگتا تھا کہ نہیں معلوم آج کیسی خبر اخبار میں ملے گی۔ لیکن پھر بھی فوراً چونک اٹھتا میرے صوفہ کی پیٹھ دروازہ کی طرف ہے اس لیے جب تک ایک آدمی اندر آ کے کھڑا نہ ہو جائے میرا چہرہ دیکھ نہیں سکتا جب جیلر آتا تھا تو میں حسب معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے اور پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتا۔ گویا اخبار دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں میں اعتراف کرتا ہوں کہ تمام ظاہر داریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جسے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا کہ کہیں دامن صبر و قرار پر بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔

بالآخر ۹/اپریل کو زہر غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا۔ دو بجے سپرنٹنڈنٹ نے گورنمنٹ بمبئی کا ایک تار حوالہ کیا جس میں حادثہ کی خبر دی گئی تھی بعد میں معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ کو یہ خبر ریڈیو کے ذریعہ صبح معلوم ہو گئی تھی اور اس نے یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا لیکن مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ اس تمام عرصہ میں یہاں کے رفقاء کا جو طرز عمل رہا اس کے لیے میں

شکر گزار ہوں ۔ ابتداء میں جب علالت کی خبریں آنا شروع ہوئیں تو قدرتی طور پر انہیں پریشانی ہوئی وہ چاہتے تھے کہ اس بارے میں جو کچھ کر سکتے ہیں کریں لیکن جونہی انہیں معلوم ہوگیا کہ میں نے اپنے طرز عمل کا ایک فیصلہ کرلیا ہے کہ میں حکومت سے درخواست کرنا پسند نہیں کرتا تو پھر سب نے خاموشی اختیار کرلی اور اس طرح میرے طریق کار میں کسی طرح کی مداخلت نہیں ہوئی ۔ اس طرح ہماری چھتیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہوگئی ۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں ۔ مگر اسی دیوار کی اوٹ سے، مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ۔ میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہوگئے ۔ یہاں احاطہ کے اندر پرانی قبر ہے نہیں معلوم کس کی ہے جب سے آیا ہوں سینکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے ۔ لیکن اب اسے دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہونے لگا ہے جیسے ایک طرح کا اُنس اس سے طبیعت کو پیدا ہوگیا ہے ۔ کل شام کو اُسے دیر تک دیکھتا رہا اور متمم بن نویرہ کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی کی موت پر لکھا تھا بے اختیار یاد آگیا ۔

لَقَالَا مَتي عِنْدَالْقُبُورِ على البُكَا
رَفِيْقِيْ لِتَنَذَّدُفِ الدُّمُوْعِ السوافكِ
فَقَالَ ابْتَلى كُلَّ قَبْرٍ رأيتَه
لِقَبْرٍ ثَوَىٰ بَيْنَ اللّوىٰ فالدكاداكِ
فَقُلْتُ له اِنَّ الشَّجَايَبْعَثُ الشَّجَا
فَدَعْنِيْ فهٰذا كُلّه ، قبر مالكِ

اب قلم روکتا ہوں ۔ اگر آپ سنتے ہوتے تو بول اٹھتے ۔

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں

(ماخوذ: سیاسی راہنماؤں کی مائیں اور بیویاں، مصنف: مولانا امداد صابری، ناشر: احمد صابری جنرل سکریٹری منتظمہ کمیٹی اقراء یونیورسٹی لونی ضلع غازی آباد یو پی، سن اشاعت: ۱۹۸۶ء)

حضرت مولانا محمد علی جوہرؒ[1] کی بیوی

(۳) محترمہ امجدی بانو بنت عظمت علی خان

بیگمِ مولانا محمد علی کا شمار ان گنتی کی مسلم خواتین میں ہے جو مردوں کے دوش بدوش ہندوستان کی سیاسیات میں حصہ لیتی ہیں۔ اس لیے ہندوستان کی سیاسی دنیا میں غالباً شاہ نواز کی بیگم کے بعد وہ سب سے زیادہ مشہور خاتون ہیں۔ وہ اپنے نامور شوہر کی زندگی ہی میں سیاسی دنیا میں قدم رکھ چکی تھیں۔ اب بھی انہیں کے نقش قدم پر چلتی ہیں اور ان کے متعین کردہ مسلک کو اپنے لیے نشان راہ بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مسلم لیگ کی جو ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے، نہ صرف سرگرم رکن ہیں بلکہ اس کی مجلس عاملہ کی ایک ممتاز رکن بھی رہ چکی ہیں۔

بیگم مولانا محمد علی جوہر کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی مذہبیت یا سچا اسلامی شعار ہے۔ یہ مذہبیت انہیں اپنے خاندان سے ورثے میں ملی ہے، بی اماں جیسی ساس اور محمد علی جیسے شوہر کے فیض صحبت نے اس میں مزید جلا پیدا کی ہے۔ انہیں اپنی سیاسی سرگرمیوں کے سلسلہ میں مردوں سے کافی سابقہ رہتا ہے، وہ بڑے سے بڑے سیاسی جلسے میں شرکت کرتی ہیں، لیکن ہر جگہ ایک مسلمان خاتون کی طرح، اسلامی شعار، اسلامی ستر، اور اسلامی آداب کو پوری طرح ملحوظ رکھتی ہیں۔

بیگمِ محمد علی رام پور کے ایک قدیم شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے والد

(۱) مولانا محمد علی جوہر ۱۰ ردسمبر ۱۸۷۸ء کو ریاست رام پور میں پیدا ہوئے، جوہر تخلص اور لقب رئیس الاحرار ہے، والد عبد العلی خان ابن علی محسن خان، وفات: ۴ رجنوری ۱۹۳۱ء یروشلم فلسطین۔

عظمت علی خاں مولانا محمد علی کے چچا زاد بھائی ہوتے تھے۔ اس طرح مولانا نے اپنے خاندان ہی میں شادی کی تھی۔ ۱۸۹۶ء میں جب وہ ابھی بہت کم سن تھیں، بی اماں کی خواہش پر مولانا سے ان کی منگنی ہوئی۔ اس وقت وہ گریجویٹ ہو چکے تھے اور انڈین سول سروس کے لیے انگلستان جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ منگنی کے بعد مولانا انگلستان چلے گئے اور چونکہ قدرت کی طرف سے ان کے لیے قوم کی سرداری مقدر ہو چکی تھی، اس لیے امتحان میں ناکام ہو کر ہندوستان واپس آ گئے۔ اسی سال بی اماں نے ان کی شادی کر دی، شادی کے وقت بیگم کی عمر ۱۳ سال اور محمد علی کی عمر ۲۰ سال سے زیادہ نہ تھی۔

شادی کے دوسرے برس مولانا محمد علی پھر راہیٔ انگلستان ہوئے اور آکسفورڈ سے انگریزی ادب میں آنرز کی ڈگری حاصل کر کے وطن لوٹے۔ جدائی کا یہ زمانہ نوعمر بیگم پر شاق تو گزرا لیکن اپنے شوہر کی آئندہ ناموری کا خیال کر کے صبر کر بیٹھیں۔ انگلستان جیسے ملک میں جہاں ''شاہد ان اصلی'' کی کمی نہیں اور اچھے اچھے زاہدوں کے دامن تر ہو جاتے ہیں'' مولانا محمد علی بیگم کو نہ بھول سکے، یہاں اپنی بے لوث' معتدل اور محتاط زندگی کے لیے وہ بہت بڑی حد تک انہیں کی ذات کی مرہون منت تھے، چنانچہ خود ہی فرماتے ہیں۔

علی گڑھ کالج میں شاعری تو کچھ کی' مگر فرضی معشوق' اگر کچھ اصلیت تھی تو اتنی ہی جتنی ایران کی شاعری کو اور ''سبزہ خط'' وغیرہ کو ایک حد تک بامعنیٰ کر دیتی ہے۔ کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا' یہاں البتہ شاہد ان اصلی کی کمی نہ تھی، مگر ذوق نظارہ لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی، تاہم طبیعت کا میلان خلاف دستور عام زہد و روع کی طرف تھا، دو برس کے قریب تو ہندوستان کے کچے دھاگے نے باندھ رکھا....''

ہندوستان کا یہ کچا دھاگہ بیگم مولانا محمد علی کے سوا اور کون ہو سکتا تھا؟

مولانا محمد علی کو اپنی بیگم سے جو محبت تھی اس کا اندازہ کچھ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ۱۹۱۴ء میں بیگم شدید بیمار ہو گئیں۔ مولانا محمد علی تیماردار بنے، حالت یہ تھی کہ پلنگ کی پٹی سے لگے بیٹھے

ہیں، اور رات رات بھر پلک سے پلک جھپکائے بغیر گزارتے رہے۔ پورے آٹھ روز اسی حالت میں گزرے اور جب بیگم کو ذرا صحت ہو چلی تو ان کو ہوش آیا۔ اس حالت میں بھی قوم کی طرف سے جو فرائض عائد ہوتے تھے، ان کو مولانا فراموش نہ کر سکے۔ اسی حالت میں ''چوئس آف دی ٹرکس'' والا معترکۃ الاراء مضمون لکھا جس کے نتیجہ کے طور پر ہمدرد اور کامریڈ کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ اس مضمون کے متعلق خود مولانا کا بیان ہے۔

''میں نے یہ مضمون چالیس گھنٹے کی لگاتار محنت شاقہ برداشت کر کے لکھا اور اس تمام عرصے میں ایک منٹ کو بھی نہ سویا، اور جب لکھتے لکھتے تھک جاتا تھا تو اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کو خود بولتا جاتا تھا اور ان سے لکھواتا تھا، اس چالیس گھنٹہ میں نہ صرف سونے سے محروم رہا بلکہ خوراک بھی قہوہ کی چند پیالیوں سے بہ مشکل ہی آگے بڑھی۔''

جب تک مولانا محمد علی رام پور اور بڑودہ میں سرکاری عہدوں پر رہے، بیگم کی زندگی کے دن نسبتاً امن وچین سے گزرے۔ اس زمانے میں مولانا کا بیشتر وقت گھر ہی پر گزرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بیگم ان دنوں کی یاد کو اپنی زندگی کا ایک عزیز سرمایہ تصور کرتی ہیں۔ لیکن یہ دن زیادہ پائدار ثابت نہ ہوئے۔

ہندوستان کی غلام قوم میں بیداری، ہمت مردانہ اور جرأت رندانہ پیدا کرنے کا عظیم الشان کام مولانا محمد علی کی قسمت میں تھا۔ ۱۹۱۱ء میں مولانا سرکاری عہدوں سے دست کش اور غلامی کی نئی دعوتوں کو ٹھکرا کر ہندوستان کی عملی سیاست کے میدان میں کود پڑے۔ اس کے بعد سے منزلی زندگی کی راحتیں، اور گھر کا چین مولانا کے لیے حرام تھا۔ بقول انہیں کے ایک کولھو کا بیل ہے جو ہفتہ کے ساتوں دن برابر گھومتا رہا ہے۔ نہ کوئی تعطیل کا دن ہے اور نہ کوئی فرصت کا وقت! زندگی میں اس تبدیلی نے بیگم پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ بھی اپنے نوجوان اور پرجوش شوہر کے ساتھ قومی خدمت کے لیے تن من دھن سے تیار ہو گئیں۔ انہوں نے گھر کی پُرامن فضا کو قومی مفاد پر قربان کر دیا، اور صبر وشکر کے ساتھ، جو ہندی عورت کا سب سے بڑا جوہر ہے، شوہر کا ہاتھ

بٹانے پر آمادہ ہوگئیں اس میں شک نہیں کہ نا امیدی میں مولانا کی ڈھارس بندھانے اور حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا جوش اور ہمت پیدا کرنے میں اس مرحومہ ومغفورہ کا بھی بڑا زبردست حصہ تھا۔جس کا یہ پیغام اب بھی قوم کی ماؤں میں ایک لرزش پیدا کردیتا ہے۔

بولی اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

اس دور میں مولانا کے یہاں چار اولادیں ہوئیں۔لڑکا کوئی نہ تھا، چاروں لڑکیاں تھیں۔ مولانا چاروں کو جان ودل سے بڑھ کر محبوب رکھتے تھے، یہ سب کچھ تھا، لیکن گھر کی فضا بدل چکی تھی، ماحول بدل چکا تھا، حالات بدل چکے تھے۔اب مولانا ہندوستان کے سب سے زیادہ محبوب قائد مولانا محمد علی تھے۔ان کی ایک ایک بات پر، ان کے ایک ایک اشارے پر قوم سر جھکائے چلنے کے لیے تیار ہوجاتی تھی۔ ہر طرف سے مولانا کو قوم کی خدمت کے دعوت نامے چلے آرہے تھے۔آج مسلم لیگ کی صدارت کررہے ہیں تو کل کانگریس کا خطبہ صدارت پڑھ رہے ہیں، آج فلاں کانفرنس، فلاں میٹنگ، فلاں جلسے کو مخاطب کررہے ہیں تو کل فلاں وفد کی قیادت کررہے ہیں۔نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی سیاست میں ان کی سرگرمیوں سے نئی جان پڑگئی۔حکومت نے ان کی ان سرگرمیوں کو روکنے کے لیے کبھی چھندواڑہ جیل میں انہیں قید کیا کبھی بیتوں جیل میں کبھی بیجاپور جیل میں لیکن ان مصیبتوں سے ان کے حوصلے پست نہ ہوئے۔ایک دو دن کی جدائی ہو تو کوئی صبر کرے یہاں برسوں نظر بندی کے نذر ہوگئے۔ اکٹھے پانچ پانچ برس تک جیل میں گزارے۔بیگم کی زندگی کا یہ زمانہ سب سے زیادہ کٹھن اور مشکل زمانہ تھا۔بی اماں جیسی شفیق ساس جنت سدھار چکی تھیں، منجھلی لڑکی آمنہ دق میں مبتلا تھی، شوہر اور ایسا شوہر جو اوروں کی تکلیف کا حال سُن کر تڑپ جائے اپنی نازوں کی پالی لخت جگر کی شکل تک دیکھنے سے مجبور، ان پے در پے مصیبتوں کے باوجود بیگم کے قدم نہ ڈگمگائے، اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں بھی انہوں نے ان کے کام کو جاری رکھا، خلافت کے لیے

لاکھوں کے چندے وصول کیے۔ پائی پائی کا حساب کتاب رکھا سیاسی جلسوں میں مولانا کی طرف سے نمائندگی کی اور جہاں تک ممکن ہو سکا مولانا کے کام کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتی رہیں۔ انہوں نے اپنی مستقل مزاجی اور صبر و رضا سے ثابت کر دکھایا کہ وہ مولانا کی سچی رفیق حیات ہیں۔ اس صبر آزما زمانہ میں ان کے ورد زبان ہمیشہ جوہر کا یہ شعر رہا کرتا تھا۔

ہے سنت ارباب وفا صبر و توکل
چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامانِ رضا دیکھ

مولانا محمد علی کی سیرت کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ ان کی زندگی ایک ہنگامہ میں گزری۔ وہ ایک بگولا تھے، جس کا کام بے چین اور برباد رہنا ہے، لیکن اس بے چینی اور بربادی میں قوم کی تعمیر کا راز مضمر ہے، مولانا کے آخری دن جس حال میں گزرے ہیں۔ وہ ہماری قومی بے حسی کا ایک دردناک مرثیہ ہے۔ مولانا کی قسمت میں گھر کا چین و آرام لکھا ہی کب تھا۔ آخر زمانہ میں اپنی قوم سے ان کی مایوسی، دو جوان شادی شدہ بیٹیوں کی موت اور مسلسل بیماری نے ان کی کمر ہی توڑ دی تھی۔ لیکن اس حالت میں بھی وہ مرد مجاہد، تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلستان جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ بیماری سے وہ بالکل فریش تھے، ان کا مرض ایسا نہ تھا جس سے جانبری کی بھی امید ہو سکتی تھی، لیکن بقول انہیں کے جہاں مسلمانوں سے متعلق کوئی مسئلہ آیا اور وہ تڑپ اٹھے۔ اس لیے طے پایا کہ ان کے ساتھ بیگم بطور تیمار دار کے جائیں۔ بیگم گئیں ایک تیمار دار بن کر، لیکن واپس آئیں ایک سوگوار بیوہ بن کر، جاتے وقت اپنے ساتھ قوم کی امیدوں کا سہارا لے کر گئیں، واپس آئیں تو اس طرح کہ تہی دست تھیں، تن پر سیاہ ماتمی لباس اور آنکھوں میں فراق کے نہ تھمنے والے آنسو تھے اور دل میں جدائی کا نہ مٹنے والا درد تھا!

بیگم کی خواہش تھی کہ ان کے شوہر کو ان کی ناقدر شناسی قوم ہی کے درمیان آرام کرنے دیا جائے، تاکہ آنے والی نسلوں میں جب کبھی سیاسی شعور پیدا ہوا تو وہ اس مرد مجاہد کی آرام گاہ

پر عقیدت کے آنسو پیش کر سکیں گی۔ لیکن ان کی یہ معقول رائے کسی نے نہ مانی اور مولانا کا جسد خاکی بیت المقدس میں سپرد خاک کیا گیا۔

اس طرح چونتیس سال تک مولانا کے ہر رنج و راحت میں شریک رہنے اور آخر وقت تک پورا پورا حق رفاقت ادا کرنے کے بعد ۱۹۳۰ء میں بیگم مولانا محمد علی اپنے گرامی قدر شوہر اور مسلمانانِ ہند کے سب سے محترم سردار سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئیں۔"

ہندوستان کی سیاسی زندگی میں مولانا محمد علی کا سب سے زبردست عطیہ جرأت و مردانگی ہے ہندوستانیوں میں یہ وصف مولانا محمد علی سے پہلے انگریزوں کے دور حکومت میں بالکل مفقود نظر آتا ہے۔ بیگم مولانا محمد علی اپنے شجیع اور نڈر شوہر کی اس خصوصیت سے کافی متاثر ہوئی ہیں۔ اب وہ ایک بے جا شرم وحجاب کرنے والی ہندوستانی خاتون نہیں۔ بلکہ ان میں ایک طرح کی مردانہ شان نظر آتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے ڈیل ڈول اور چہرے مہرے پر یہ شان کھلتی بھی خوب ہے۔

بیگم نے ہندوستانی سیاست کے بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں، وہ دنیا کی بھی کافی سیر کر چکی ہیں۔ حج بیت اللہ سے مشرف ہو چکی ہیں اور مولانا کے آخری سفر انگلستان میں ان کے ساتھ رہ چکی ہیں۔ بیگم کا سب سے بڑا وصف ان کی مستقل مزاجی اور صبر و توکل ہے، وہ ہر کار خیر میں تعاون کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ یہی وہ صفات ہیں جو ایک بڑے آدمی کی رفیق حیات کے لیے ازبس ضروری ہیں۔

(ماخوذ: مشاہیر کی بیویاں، مصنف سید مبارز الدین رفعت (ایم اے)، سن اشاعت: مئی ۱۹۴۴ء)

☆......☆......☆

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی(۱) کی بیوی

(۴) محترمہ عفت النساء بنت شیخ محمد یوسف الزماں

۸ رشوال یوم سہ شنبہ تھا اور جنوری ۱۹۶۹ء کی پہلی تاریخ کو ساڑھے بارہ بجے شب کے بعد ایک مومن بندی کی روح ۷۱، ۲۷ سال کی عمر میں اپنے مالک ومولی کے حضور طلب کرلی گئی جیسی کہ بے شمار روحیں ہر لحہ و ہر آن طلب ہوتی رہتی ہیں، اللہ اس کے موجودہ مسکن کو جنت کے پھولوں سے بھر دے اور اسے جنت ہی کا ایک چمن بنادے۔

جون ۱۹۱۶ء میں اس سیاہ کار کے عقد ازدواج میں آئی تھی۔ ۵۲ سال کی مدتِ رفاقت کچھ تھوڑی نہیں ہوتی، جب کہ رفاقت محض رسم وضابطہ کی نہ ہو بلکہ اس کی بنیادیں الفت ومحبت پر قائم ہوئی ہوں! پیمانِ وفا عمر بھر کا تھا لیکن خود عمر کی پائداری کتنی؟

عمر بھر کا تونے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے

شادی جس وقت ہوئی طرفین ۷۰، ۵۰ برس کے بوڑھے کھوسٹ نہ تھے۔ ایک طرف شوخ قبول صورت نوجوان لڑکی تھی ۲۰۔۲۱ سال کی عمر کی اور وقت کے معیار سے خاصی پڑھی لکھی۔ انگریزی کی شُد بد سے واقف اور لکھنؤ کے اونچے معاشرے کی تربیت یافتہ اور دوسری طرف ۲۴ سالہ نوجوان انگریزیت میں غرق' دین ومذہب کے نام سے بیزار، عقلیت اور نیشنلزم کا پرستار، لڑکی کہیں باہر کی نہیں اپنے خاندان ہی کی تھی، حقیقی خالہ کی پوتی رسم ورواج خاندان کے برخلاف اسے شوق اور چاؤ کے ساتھ خواستگاری کر کے لانے والا مشرقی اور نیم

---

(۱) مولانا عبدالماجد دریابادی کے والد بزرگوار ڈپٹی کلکٹر مولانا عبدالقادر ابن مفتی مظہر کریم دریابادی، ولادت ۱۶رمارچ ۱۸۹۲ء دریاباد ضلع بارہ بنکی یوپی، وفات ۶رجنوری ۱۹۷۷ء گولہ گنج لکھنؤ، تدفین: دریاباد، ضلع بارہ بنکی۔

اسلامی حیاداری کے حدود کے اندر رہ کر راہ و رسم دیار محبوبی کے قدم ایک ایک کر کے اٹھتے رہے تا آنکہ شوہر کو دو چار سال بعد از سر نو سعادت اسلام نصیب ہوئی۔ دونوں نے ۱۹۲۹ء میں مل کر حج کیا اور آخر سن کے تقاضے سے وہ وقت بھی آ گیا جب زلفوں کی سیاہی سفیدی میں تبدیل ہوگئی دانتوں کی جمی ہوئی لڑی ساری ایک ایک کر کے بکھر گئی، چہرے پر جھریوں کی بدھیاں پڑ گئیں۔ قد و قامت میں کوئی شائبہ رعنائی کا باقی نہ رہا حسن و جمال کی جگہ صرف نور عصمت کی جگمگاہٹ باقی رہ گئی۔

ہے حقیقت مجاز اب یہ کھلا ہے جا کے راز
سب ہے فریب آب و گل حسن و جمال کچھ نہیں

مسلسل اور متعدد بیماریوں نے معذور اور تقریباً فریش بنا ڈالا۔

میں نوائے سوختہ در گلو نو پریدہ رنگ رسیدہ بو
میں حکایت غم آرزو تو حدیث ماتم دلبری

اس پر بھی اس رشتۂ محبوبیت میں بحمداللہ ذرا بھی فرق نہ آیا! اور بد بخت شاعر اور افسانہ نویس حقیقت حال سے منزلوں دور اور بیگانہ ہیں جنہوں نے الفت و محبت کے کرشموں کو صرف جوانی کے چند برسوں تک محدود رکھا ہے۔

اول ہاتھ میں لینے والی چیز حسن صورت نہیں حسن سیرت ہوتی ہے اور اللہ کے اس دولت سے مرحومہ کو حصہ وافر ملا تھا۔ عورت کا جوہر سسرال والوں کی خدمت کرنا ہے اس مرحومہ نے یہاں آتے ہی میری والدہ اور ہمشیرہ کا دل اپنے ہاتھ میں لے لیا جو خاندان مشترکہ کہلاتا ہے اس میں آپس کی سابقہ الجھنیں اور زیادہ ہوتی ہیں۔ یہاں میرے بھائی اور بھاوج دونوں اس سے رام ہو گئے۔ خاندان کے دوسرے عزیز و اقارب ملنے والوں، گھر کی خادماؤں سب پر اس نیک بخت کی میٹھی زبان، خوش مزاجی، فیاض طبعی نے اپنا سکہ جما لیا تھا، داد و دہش و غریب پروری داخل فطرت تھی۔ ابتدائی ماحول اہل رسوم و بدعات کے درمیان

رہا۔ رفتہ رفتہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے قرب و اعتقاد بڑھتا ہی گیا اور میرے تمام مخلص بزرگوں مولانا مناظر احسن گیلانی اور علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالحسن علی الندوی وغیرہم کے خیالات سے استفادے کے پورے موقع ملتے رہے۔ نماز کی پابند شروع میں بھی نہ تھیں، کچھ روز میں پوری پابند ہوگئیں، روزے جب تک قوت باقی رہی پابندی سے رکھتی رہیں، آخر عمر میں فدیہ باضابطہ دیتی رہی تھیں، مسلمانان عالم کی فلاح و بہبود کے لیے دل میں تڑپ تھی اودھ ہی کے ایک خاندان نے اپنا وطن ''شہر باندا'' دو تین پشتیں قبل بنالیا تھا وہی میکہ تھا۔ اس کی محبت دل میں رچی بسی ہوئی تھی۔

ماں بڑی عابدہ پائی تھیں وہ وہیں دفن تھیں بڑی تمنا ان ہی کے پہلو میں دفن ہونے کی تھی بھائی (خان بہادر مسعود الزماں بیرسٹر اور نائب صدر یوپی کونسل) کی دو پوتیوں کی شادی باندے میں ۲۹/ دسمبر کو طے پائی، شروع رمضان میں وہیں چلی گئیں، عید سالہا سال کے بعد وہیں کی۔ شادی کے بعد دو ایک ہفتہ وہیں قیام کا ارادہ تھا کہ پہلی اور دوسری جنوری کی درمیانی شب میں بلاوا وطن حقیقی سے آگیا! اور مسبب الاسباب نے گورستانِ باندا ہی دفن ہونے کا سامان یوں بہم پہنچا دیا۔ دعائیں قبول ہوتی ہے ایک بڑی آرزو شب جمعہ پانے کی تھی تو وفات کے لیے تو نہیں لیکن تدفین کے لیے شب جمعہ ہی نصیب ہوگئی۔

ساڑھے باون سال کی طویل رفاقت میں جدائی کا اتفاق کبھی بھی تین چار ہفتوں سے زیادہ کا نہ ہوا۔ ہمیشہ کہنا چاہیے کہ یکجائی ہی رہی۔ اب کی اور آخری روانگی جب باندے کے لیے ۱۶/ رمضان (۷/ دسمبر) کو اختیار کرنے لگیں تو اپنے ساتھ وہ کفن بڑے اہتمام سے سامان میں رکھ لیا جو سالہا سال سے آب زمزم میں ترکیا ہوا محفوظ تھا۔ ایک مخلص نے مکہ معظمہ سے مجھے خانہ کعبہ کی چھت کے کچھ ٹکڑے بطور تبرک بھیج دیئے تھے ان میں سے بھی ایک ٹکڑا اپنے ہمراہ رکھ لیا، پہلی اور دوسری جنوری کی درمیانی شب میں گیارہ بجے تک جاگتی بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ میری بڑی لڑکی ہمراہ تھی اور انگیٹھی کے گرد بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے میری زبان

سے کبھی سنا ہوا قصہ بیان کیا۔ قاضی یحییٰ بن اکثم تیسری صدی ہجری کے شروع کے بزرگوں میں ہوئے ہیں۔ صحیح بخاری کے راویوں میں ہیں۔ ان کی وفات پر ان کے ایک معاصر نے انہیں خواب میں دیکھا اور حسب توقع اچھی حالت میں دیکھا پوچھا کیا ماجرا گزرا؟ انہوں نے فرمایا کہ قبل اس کے کہ کوئی سخت سوال یا جرح مجھ سے شروع ہو، میں بہ اطمینانِ تمام مسکرایا۔ سوال ہوا کہ عین سوال و جواب کے موقع پر یہ تبسم کیسا؟ میں نے عرض کیا مجھ سے حدیث بیان کی فلاں فلاں سے اور اس نے فلاں صحابی سے اور اس نے رسول اللہ ﷺ سے اور آپ ﷺ نے فرشتہ جبرئیل سے اور انہوں نے تجھ (اللہ تبارک وتعالیٰ) سے کہ مجھے بوڑھے مومن سے جرح کرتے مروت مانع آتی ہے اور میں سفید بال لے کر تو بہر حال آیا ہوں، بس اس سے مجھے اطمینان ہے، اس پر معاً جواب ارشاد ہوا کہ سچ کہا جبرئیل نے اور سچ کہا ہمارے رسول نے اور سچ کہا ان صحابی اور فلاں فلاں راویوں نے بے شک اسی پر تمہاری مغفرت ہوئی جاتی ہے۔

یہ روایت میں نے کبھی حضرت تھانوی کی زبان سے سنی تھی۔ دو ایک جزئیات میں جو کچھ بھی فرق ہو گیا ہے حکایت سن کر اور بھی سننے والیاں متاثر ہوئیں اور بولیں اللہ ری بندہ نوازی۔

لاشعوری طور پر بشارت کا یہ منظر پیش آجانے کے کوئی گھنٹہ ہی ڈیڑھ گھنٹہ بعد کوئی سوا بارہ پر مرحومہ کو سوءِ تنفس (سانس پھولنے) کی شکایت پیدا ہوئی اور یہ شکایت شب میں اکثر پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ لڑکی کو جگا کر وہ دوا استعمال کی جو ایسے موقع پر نفع کر جایا کرتی تھی۔ آج نفع نہ ہوا۔

بہنیں اور بھتیجیاں وغیرہ سب بھاگ کر آ گئیں۔ ان کے حقیقی بھتیجے لکھنؤ میڈیکل کالج کے ایم بی بی ایس ڈاکٹر پاس ہی کے کمرے میں تھے اور گولیاں نکال کر انہوں نے چاہا کہ گولی ہاتھ میں لے کر اپنے حلق تک لے جائیں کہ معاً سر جس طرح نیند سے جھوم کر کوئی بیٹھا ہوا شخص گرنے لگتا ہے، یہ لیٹنے لگیں لڑکی نے اپنی گود میں لے لیا اور آناً فاناً روح قفسِ جسم خالی کر گئی۔ انہیں چند لمحوں کے اندر بغیر کسی خاص کش مکش کے! بدحواس نورِ نظر ڈاکٹر بھاگتا ہوا گیا اور دوڑتا ہوا انجکشن لایا، لگانا چاہا مگر تقدیر کے آگے سر پکڑ کر بیٹھ گیا، زبان سے بس یہ نکل سکا کہ

اب دوا کا وقت گزر چکا ہے۔ نزع وسکرات کے ان چند مختصر لمحوں میں ایک نہیں دو بار کلمۂ شہادت زبان سے ادا کیا! ایک بار خود سے کہا کہ دیکھو اب سانس میں کھٹک پیدا ہوگئی معاً بعد قبض روح پیشانی پر پسینے کے چند قطرے دیکھے گئے۔ آخری دیدار جب کفن چہرہ سے سرکا کر کرایا گیا تو میرے علاوہ اور لوگوں کا بیان ہے کہ چہرہ قبلہ رو تھا چہرہ پر تسکین وبشاشت تھی آنکھیں بالکل بند تھیں ہونٹ بالکل بستہ چہرہ کی تکیا پوری گولائی لیے ہوئے تھی (حالانکہ دانت گرجانے کے بعد یہ قطع عموماً باقی نہیں رہ جاتی) اور ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم اور ہلکی سی سرخی تھی۔

۲رجنوری ۱۹۶۹ء جمعرات کو قریب شام ایک لاری ۲۵۔ ۳۰ مسافروں سے بھری ہوئی لکھنؤ سے باندے جارہی ہے اور اس وقت کان پور کے حدود میں داخل ہو رہی ہے سفر تفریحی نہیں! ماتمی ہے تین لڑکیاں ہیں جو ابھی چند ہی گھنٹے ہوئے ماں کے سایہ سے محروم ہوئی ہیں اور جس کا جنازہ اپنی بچیوں کا انتظار کر رہا ہے۔ ایک ۷۵۔ ۷۶ سال کا بوڑھا ہے جو ابھی دنیا کی عزیز ترین متاع سے محروم ہو چکا ہے۔ اسی طرح چھوٹے بڑے دوسرے عزیز واقارب ہیں۔ کسی کی زبان پر کلمۂ شہادت اور کسی کی زبان پر قرآن کی سورتیں اور اکثر کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ وقت سواپانچ سے گزر چکا ہے۔ آفتاب زرد پڑ چکا ہے اور ہر منٹ بلکہ ہر سکنڈ اور ڈوبتا ہی چلا جا رہا ہے۔ کھلے میدان میں جب کبھی غروب آفتاب کا منظر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے دل ہمیشہ اس سے متاثر ہوا ہے۔ رفیقہ زندگی ہی کے آخری لمحات نے حیات کا نقشہ نگاہوں کے سامنے کر دیا ہے آج یہ خیال نہیں واقعہ ہے، قال نہیں حال ہے۔ اپنی دنیوی زندگی کے لطف وسکون وراحت کا آفتاب ڈوب رہا نہیں بلکہ واقعتہً ڈوب چکا ہے۔

ساڑھے دس بجے شب کو لٹا پٹا قافلہ باندے یوسف منزل کے پھاٹک پر پہونچا۔ اس ۵۲ سال کے عرصہ میں خدا جانے کتنی بار اس ڈیوڑھی پر قدم رکھنے کا اتفاق ہو چکا تھا۔ ہر بار اس سے کس درجہ مختلف! آج کی آمد سب سے نرالی تھی۔ درودیوار تک گویا رو رہے تھے۔ کفن پوش چہرے کو خاموش وساکت ہوئے ۲۲ رگھنٹے ہو چکے تھے باندے سے لکھنؤ اور پھر

دریاباد رابطہ قائم کرنے ہی میں ٹیلیفون اور تاردونوں کے ذریعہ سے دس بارہ گھنٹے لگ گئے تھے۔ باقی دس گھنٹے پہونچنے کی کوشش میں لگ گئے۔ لاشۂ بے روح کو سامنے دیکھ کر کیا گزر رہی ہے یہ نہ پوچھئے وہ وقت بہرحال یاد آگیا جب کسی بڑی سے بڑی خوش جمال وخوش صفات خاتون کا ذکر سننے میں آتا تھا اور طبیعت میں بجائے کسی قسم کے رشک کے ایک گونہ فخر واطمینان ہی قائم رہتا تھا۔ بقول استاد شبلیؒ ؎

یاد آں روزے کہ دست افشاں گزشتم از حرم

از غرور آں کہ من ہم آستاں داشتم!

نعمت بہرصورت فانی ہی تھی اور دو ہی چار لمحہ کے بعد یہ صدا بلند ہوئی کہ ناسوت'' کی آخری زیارت ختم بس اب آئندہ دیدار ان شاء اللہ جنت ہی میں نصیب ہوگا۔

زندگی میں جب بھی وفورِ اُنس وافراد نطق پر نفس کو تنبیہ ہوتی تھی تو ذہن کے سامنے دنیا کے محتاط ترین، مقبول ترین، متوازن ترین، دانا ترین بشر کا اسوۂ حسنہ مائی عائشہ اور مائی خدیجہؓ اور پھر کم وبیش اُمّت کی دوسری ماؤں کے ساتھ آجاتا تھا اور آفتاب عالمتاب کے نور کے آگے کسی صوفی کسی مجذوب کسی راہب کسی یوگی کی چقماقیت کی ہستی ہی کیا تھی اور اپنے زمانے کے مرشد کامل حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی نظیر بھی سامنے تھی جب بھی حضرت کے سامنے اپنا یہ حال رکھا جواب میں بہ کمال ملاطفت یہی تسلی ارشاد ہوئی کہ

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

اور چھوٹے اگر بڑوں کے نقش سے تسکین ورہنمائی نہ حاصل کریں تو کیا کریں۔

غرض یہ کہ جس وقت کے آنے کا دھڑکا سالہا سال سے ہر گھڑی لگا چلا آرہا تھا وہ آخر اپنے وقت موعود پر آہی گیا اور جس حیّ وقیّوم نے صبر کا مطالبہ کیا، اسی نے گرتی ہوئی قوت بھی صبر کی بخشدی! کارخانۂ کائنات میں ایک ذرہ بھی فرق نہ آنے پایا اور دنیا جس طرح چل رہی تھی ٹھیک اسی طرح چلتی رہی۔ کل شئی ھالك الاوجھہ اور کُل من علیھا فان.

قسم کے ارشادات بے معنی نہیں۔سرتاسر بامعنی ہی تھے۔اپنے مخدوم بزرگ اور محترم دوست مولانا سید سلیمان ندویؒ فاضل و عارف تھے۔شاعر نہ تھے لیکن شعر بھی خوب کہہ لیتے اپنی زوجہ ثانیہ سے کمال لطف والتفات رکھتے تھے۔وفات پر مرثیہ کہا اس کے اس شعر میں شاعری نہیں کی، حقیقت کی ترجمانی کی ہے ؎

تیرے جانے سے گماں برہمیٔ دہر کا تھا
تو گیا اور بپا دہر میں محشر نہ ہوا!

کسی بندہ کی خود یہ خام خیالی بھی کس درجہ طفلانہ ہو سکتی تھی! حدیث نبوی ﷺ میں آیا ہے کہ جسے ۴۰ مسلمان اچھا کہیں اس کی مغفوریت کی امید رکھو۔پھر جسے زبان ہی سے اچھا کہنے والے نہیں بلکہ جس پر آنکھوں سے آنسو بہانے والے ۴۰ سے کئی گنے زیادہ بحمداللہ نکل آئے ہیں اس کے حق میں کسی کی شان غفاری سے کسی اغماض کا احتمال بھی آخر کیسے کیا جائے۔

اے الہ العالمین! اس عفت شعار کی ناسوتی زندگی ختم ہوگئی، بندی اپنے پروردگار اور ہمدرد رحمت و مالک کے حضور میں حاضر ہوگئی ہے۔کسی ظالم و جابر حاکم کے دربار میں نہیں! تجھ سے بڑھ کر رحم و فضل کرنے والا اور کون ہے۔تو ہی سرچشمہ ساری مہر و بخشش کا ہے۔تیرے آگے سفارش و شفاعت کی زبان کہاں سے کھول سکتا ہوں صرف ایک چشم دید و ہمہ وقت گواہ اور ویسے بھی بطور ایک عاجز و درماندہ بندے کے دو ایک گواہیاں عرض کیے دیتا ہوں۔

(ا) جب یہ بیاہ کر آئی ہیں، یہ بہر حال مسلمان اور تھوڑی بہت پابند مذہب تھیں۔انہوں نے اپنی والی ہر کوشش مجھے مذہب کے دائرہ میں دوبارہ واپس لانے کی کر ڈالی اور بالآخر تصحیح عقائد کے بعد تجدید عقد ہو کر رہی۔

(۲) اس وقت کے جاہلی رواج خاندانی کے ماتحت اس کے عقد کا مہر پونے دو لاکھ اشرفیاں یعنی لکھنؤ کا روپیہ قرار پایا تھا۔خود انہوں نے آگے چل کر مسائل سے واقفیت کے بعد، اس فرضی و افسانوی تعداد کو گھٹاتے گھٹاتے پچاسوں یا چند دہائیوں تک کے سوا سب

معاف کر دیا تھا اور مہر کی رقم میرے اس وقت کے حسب حیثیت تھی وہ معاً ادا کر دی گئی یہ کتنا بڑا احسان ان کا میری گردن پر رہا۔

(۳) میرے قصد حج کے وقت یہ بھی چلنے پر آمادہ ہو گئیں، بغیر مجھ سے ذرا بھی روپیہ لیے خود ان کے پاس بھی کہاں تھا اپنا زیور اپنی بہن کے پاس رہن رکھ کر ان سے روپیہ لیا اور تمام تر اپنے خرچ پر میرا ساتھ دیا یہ ان کا دوسرا احسان ہے جسے میں بھول نہیں سکتا۔

(۴) شروع زمانہ میں میں بڑا ہی سخت گیر آقا تھا اور نوکروں چاکروں پر بڑی ہی سختی کرتا یہی بے چاری ہر بار سامنے آ کر سینہ سپر ہو جاتیں۔

خدمت قرآن یا خدمتِ صدق وغیرہ کے سلسلہ میں اگر کوئی بھی خدمت دین کسی درجہ میں بھی قابل قدر تیری نظر میں مجھ بے مایہ و تباہ کار سے بن پڑی تو وہ ہرگز مجھ سے نہ بن پڑتی اگر وہ خانگی سکون قلب مجھے حاصل نہ ہوتا جو تیری اس بندی کے طفیل میں مجھے نصیب ہوا۔

لوگ تعزیت کو میرے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ تباہ ہو گئے آپ کا گھر اجڑ گیا وغیرہ، میں حیران ہوں کہ کیسی تباہی اور کہاں کی ویرانی، اللہ اپنے عزیز بندے کو اگر بہترین ساعت میں اس دنیا میں بھیجتا ہے جو اس بندے کے حق میں ہو بہترین ساعت ہوتی ہے اسی میں اسے واپس بلاتا ہے اس میں ویرانی و بربادی کا ذکر کہاں سے آ گیا۔

اُس بندی کے اٹھ جانے سے مجھے یقیناً قدرۃً متعدد تکلیفیں اور بے چینیاں ہیں اور میں اس پر ہرگز خوشی سے آمادہ نہیں لیکن اگر تیری مرضی اسی میں ہے تو میں ایک بار نہیں ہزار بار اس پر راضی اور عقلاً و ارادۃً شائبہ بھی کسی ناخوشی و ناگواری کا اپنے دل میں نہیں لاتا۔

(ماخوذ: وفیات ماجدی، مرتب: حکیم عبدالقوی دریابادی، ناشر: مولانا عبدالماجد دریابادی اکادمی، کچہری روڈ لکھنؤ، سن اشاعت: دسمبر ۱۹۷۸ء)

☆......☆......☆

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب(۱) کی بیوی

(۵) محترمہ حنیفہ خاتون بنت مولانا حافظ محمود رامپوری

احقر کی اہلیہ حنیفہ خاتون مرحومہ جن کا انتقال ۱۰رمحرم الحرام ۱۳۹۴ھ مطابق ۳رفروری ۱۹۷۴ء یوم دوشنبہ بوقت ۱۱ بجے شب عاشورہ کو ہوا، مولانا حافظ محمود صاحب مرحوم رامپوری وزیر ریاست اندرگڈھ (راجپوتانہ) کی بیٹی، مولانا حافظ حکیم احمد صاحب مرحوم رئیس رام پور کی حقیقی بھتیجی اور حضرت اقدس مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب خلیفہ ارشد حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید کی پوتی ہوتی تھیں۔ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے تھیں اور انصار کے قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ حضرت شیخ سالار بندگی تھے۔جن کا مزار رامپور میں ہے۔

ادھر ننہال میں حضرت شاہ صادق احمد صاحب انبہٹوی سجادہ نشین حضرت شاہ ابوالمعالی قدس سرہٗ کی نواسی تھیں، حضرت شاہ ابوالمعالی کا خاندان انبہٹہ ضلع سہارنپور میں اہل علم وفضل اور اہل تصوف کا ممتاز خانوادہ رہا ہے، اسی خاندان کے چشم و چراغ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب انبہٹوی (معروف بہ حضرت سہارنپوری) حضرت مولانا صدیق احمد صاحب انبہٹوی اور مولانا شاہ ظہور احمد صاحب انبہٹوی، حضرت گنگوہی کے اجل خلفاء میں سے تھے، جن سے بہت سی قریبی قرابتیں قائم ہیں۔حضرت اقدس مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نوراللہ مرقدہٗ کا خاندان بھی رامپور کے اسی خانوادہ سے تعلق رکھتا تھا اور عزیز داریاں تھیں اس لیے حضرت گنگوہی کا خاص اور گہرا تعلق اس گھرانے سے تھا۔

---

(۱) حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے والد محترم مولانا محمد احمد اور دادا بانیٔ دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی ہیں۔ ولادت: ۱۸۹۸ء دیوبند، فراغت: ۱۹۱۸ء دارالعلوم دیوبند، اولاد: مولانا محمد سالم قاسمی، مولانا محمد اسلم قاسمی، مولانا محمد عاصم قاسمی، مولانا محمد اعظم قاسمی۔

مرحومہ حضرت شاہ منظور احمد صاحب گنگوہی خلیفہ حضرت گنگوہیؒ سے بیعت تھیں، جن سے خاندانی عزیز داری بھی تھی، ان چند در چند نسبتوں سے مرحومہ بہت سی خاندانی عظمتیں لیے ہوئے تھیں جن کے آثار ان میں نمایاں تھے۔

خود اپنی ذات سے بھی نہات صالحہ، پابندِ اوقات اور اپنے معمولات پر مستقیم تھیں۔ میں ان کے معمولات کو غبطہ کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا اور بسا اوقات ذہن میں یہ تصور بندھ جاتا تھا کہ شاید یہی خاتون میرے لیے بھی نجات کا ذریعہ بن جائے۔ مرحومہ کو فرائض کی ادائیگی کا حد درجہ اہتمام تھا، گھر کے کیسے ہی اہم کام میں مصروف ہوں، اذان کی آواز سنتے ہی ہر کام میں بیگانہ وار اٹھ کر اول اوقات میں نماز ادا کیے بغیر مطمئن نہ ہوتی تھیں۔ ایک ہزار دانے کی تسبیح ہمیشہ ان کے سرہانے رہا کرتی تھی، نماز عشاء کے بعد ایک ہزار بار کلمۂ طیبہ اور وقتِ خواب ادعیہ ماثورہ پڑھنے کا معمول تھا جو سفر اور حضر میں جاری رہتا تھا۔

نماز صبح کے بعد تلاوت قرآن کریم اور نماز ظہر کے بعد ادعیہ ماثورہ کے ایک حزب کا معمول تھا جو سفر اور حضر میں بغیر کسی شدید اور غیر اختیاری مجبوری کے ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ حج کا ایک خاص شغف دل میں تھا، میری معیت میں سات بار حج و زیارتِ روضۂ اقدس سے مشرف ہوئیں۔ حضرت مولانا محمد سلیم صاحب کیرانوی ثم المکی زید مجدہم مہتمم دار العلوم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ سے عزیز داری تھی، مکہ میں قیام انہیں کے دولت خانہ پر ہوتا تھا، مولانا کے گھرانے کے ہر بچے اور بڑے کو ان سے ایک خاص انس اور علاقہ تھا، ہر سال حج کے موقع پر ادھر سے برابر یاد ہوتی اور یاد دہانی کی جاتی کہ ہم سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ اسی علاقہ خاص سے حضرت مولانا سلیم صاحب کا مقولہ تھا کہ:

”جو شخص یہ ثابت کر دے کہ مکہ مکرمہ میں (مولانا) محمد طیب کا گھر نہیں ہے تو میں اسے ایک ہزار روپیہ انعام دینے کے لیے تیار ہوں۔“

بہر حال مولانا کا سارا گھرانہ ان سے حد درجہ مانوس تھا اور وہ ان سے مانوس تھیں،

بالخصوص عزیز محترم مولوی محمد شمیم ابن حضرت مولانا محمد سلیم تو خاص طور پر ان کی خاطر داری اور مدارات میں لگے رہتے تھے، اور ان سے مرحومہ کو خاص انس تھا، اور کہا کرتی تھیں کہ مجھے شمیم پر ایسا ہی پیار آتا ہے جیسے سالم پر ہے۔

حج و نماز اور اوقات کی پابندی کے ساتھ ان میں یہی شغف ادائے زکوٰۃ کا بھی تھا، پائی پائی کا حساب کر کے عموماً ماہ رمضان میں زکوٰۃ ادا کیا کرتی تھیں، شہر کے عزیزوں میں سے غرباء اور بالخصوص غریب بیواؤں کی فہرست ان کے سامنے رہتی تھی جن کی مالی مدد خاموشی کے ساتھ ہوتی رہتی تھی۔

رمضان شریف میں روزہ کے ساتھ تراویح کی جماعت اور ختم قرآن شریف کا خاص شغف تھا، گھر پر مردوں اور عورتوں کی مشترک جماعت ہوتی تھی، ان کے اصرار پر کبھی یہ احقر اور کبھی برخوردار مولوی محمد سالم سلمہ ایک پارہ یومیہ تراویح میں سناتے تھے، صرف یہی ایک رمضان (۱۳۹۳ھ) کا ایسا گزرا کہ وہ بوجہ مرضِ موت شریکِ تراویح نہیں ہوسکیں اور اس پر بے حد مغموم رہیں۔ بہر حال ادائے صلوٰۃ وصیام، اہتمام حج وزکوٰۃ اور ذکر واذکار کی ایک خاص لگن ان کے دل میں موجزن رہتی تھی۔

مرحومہ سے میرا رشتہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ لے کر رامپور پہنچے تھے، چونکہ حضرت شیخ الہند کا تعلق بھی اس خاندان سے گہرا تھا اور مولانا محمود صاحب رامپوری مرحوم حضرت کے خاص شاگرد تھے اور دوسرے علاقے بھی بزرگوں کی نسبت سے قوی تھے، ادھر حضرت کو میرا یہ رشتہ بہت زیادہ عزیز بھی تھا، اس لیے حضرت نے مولانا حکیم حافظ احمد سے فرمایا کہ بھائی اس وقت میں نائی کی حیثیت سے آپ کی بھتیجی کا رشتہ طیب سے لے کر آیا ہوں رشتہ تین چار سال لگا رہا نکاح طے پا گیا تو مقررہ تاریخ پر علماء اور صلحائے وقت سب ہی بارات میں شریک ہوئے، تقریباً سوسوا سو آدمی کی بارات تھی، حضرت تھانوی نے نکاح پڑھا۔

بارات کی واپسی ایک شب قیام کے بعد اگلے دن عصر کے بعد ہوئی اور رات کو تقریباً

ایک بجے دیوبند پہنچنا ہوا، سردی کا زمانہ تھا، عشاء کے بعد دیوبند میں اس غیر معمولی تاخیر سے تشویش محسوس کی گئی، بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ مولانا محمود صاحب نے کافی اور بہت قیمتی جہیز دیا تھا، جس کی شہرت تھی حتیٰ کہ علاوہ ہمہ قسم سامانوں کے دلہن کے لیے نفیس پالکی اور دولہا کے لیے گھوڑا بھی جہیز میں دیا تھا جو سر سے پیر تک چاندی کے زیور سے آراستہ تھا اور زین مخملی تھا جس پر زری کے کارچوب کا کام تھا، یہی نوعیت دوسرے سامانوں کی بھی تھی، رات کا وقت کچی سڑک اور درمیان میں دیہات کا قصہ، اس لیے دیوبند میں اس تاخیر سے تشویش محسوس کی گئی۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب شادی کے سلسلہ میں مقامی نظم کے ذمہ دار تھے، انہوں نے اس تشویش کا ذکر طلبہ سے کیا، جس پر ڈھائی تین سو طلبہ دیوبند سے رامپور کی سڑک پر روانہ ہو گئے۔ دیوبند سے چھ میل آگے پہنچ کر طلبہ کا مجمع بارات سے جا ملا اور بارات کے ساتھ لوٹا، طلبہ نے اپنی محبت و تعلق سے پالکی سے کہاروں کو ہٹا کر خود پالکی اپنے کندھوں پر اٹھائی اور نوبت بنوبت پالکی لے کر چلے۔

وہ سماں عجیب تھا کہ مختلف وطنوں کے طلبہ بنگالی، پنجابی، آسامی، سرحدی اور گجراتی وغیرہ اپنی اپنی زبانوں میں گیت گاتے جاتے تھے اور پالکی اٹھائے چلے جا رہے تھے، یہ مرحومہ کی خوش قسمتی تھی کہ رشتہ سرتاجِ علماء شیخ الہندؒ لے کر گئے، نکاح سر خیلِ علماء حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ نے پڑھا، بارات میں وقت کے تمام علماء، صلحاء اور اکابر وقت شریک ہوئے اور پالکی اٹھانے والے طلبائے علم دین تھے جو اپنے سروں پہ مرحومہ کو لائے اور آخرکار جنازہ بھی جب اٹھا تو وہ بھی انہی طلباء و علماء کے کندھوں پر اٹھا۔

۱۳۳۴ھ میں میرا نکاح ہوا جب کہ میری عمر بیس سال کی تھی اور مرحومہ کی عمر اٹھارہ سال کی تھی، میری ولادت جمادی الثانی ۱۳۱۵ھ کی ہے، اس لیے مرحومہ کی ولادت کا سن ۱۳۱۷ھ نکلتا ہے اور اس حساب سے انہوں نے اٹھہتر سال کی عمر پائی جب کہ میں اس وقت

(۱۳۹۴ھ) میں اسیّ سال کی منزل میں ہوں، اس لیے ان کے ساتھ میری رفاقت ساٹھ سال رہی ہے، اس پوری مدت میں اہلیہ ہونے کے رشتہ سے میں ان سے اتنا متاثر نہیں تھا جتنا کہ ان کی ذاتی صلاحیت و استقامت اور جذبہ اطاعت و راحت رسانی وغیرہ سے متاثر رہا۔

خدمت واطاعت میں مزاج شناسی اور نفسیات کی رعایت کا انہیں خاص ملکہ تھا، بات سن کر فوراً اس کی تہہ تک پہنچ جانا اور اصولی جواب دینا ان کا خاص رنگ تھا یہی ذہانت تھی کہ عمر کا ایک بڑا حصہ راجپوتانہ میں گزارنے کے سبب گجراتی زبان اور ہندی لکھنے پڑھنے کا خاص ملکہ پیدا کرلیا تھا، اکثر دارالعلوم کے ہندی اور گجراتی زبانوں کے خطوط میں انہیں سے پڑھواتا اور ترجمہ کراتا تھا، گجرات کے سفروں میں بڑودہ، سورت راندیر اور بمبئی وغیرہ میں وہ گجراتی عورتوں کی باتیں بے تکلف سمجھ کر ان سے گجراتی میں بات چیت کرلیتی تھیں۔

اسی طباعی کا اثر تھا کہ حجاز کے متعدد سفروں میں معمولی عربی سمجھنے اور ٹوٹی پھوٹی بول لینے میں انہیں تکلف نہیں ہوتا تھا، حجاز میں اکثر عرب اور مصری عورتوں سے ٹوٹی پھوٹی عربی میں گھنٹوں بات چیت کرتی رہتی تھیں، محض زکاوتِ طبع سے عربی بول چال پر ایک گونہ قدرت حاصل کرلی تھی۔ جس زمانہ میں معتمر عالم اسلامی مصر نے اپنے دو فاضل استاذ شیخ عبدالمنعم النمر اور شیخ عبدالعال العقباوی کو دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت استاذِ عربیت تین سال کے لیے بھیجا اور وہ مع اپنے اہل وعیال کے یہاں آکر مقیم ہوئے تو ان کی مستورات کا گہرا تعلق مرحومہ ہی سے رہا کیوں کہ عربی بول چال میں ان کا کوئی بھی ہم زبان یہاں کی عورتوں میں مرحومہ کے سوا دوسرا نہ تھا، حتی کہ دیوبند میں تقریبات کے مواقع پر جب مصری مستورات کو دعوت دی جاتی تھی تو ترجمانی کی ذمہ داری مرحومہ ہی کے سر رہتی تھی۔

طرز کلام شیریں ہونے کے علاوہ انتہائی بامحاورہ اور اردو زبان کی ضرب الامثال اور کہاوتوں پر مشتمل ہوتا تھا، اردو زبان کے بہت سے غیر معروف محاورات کا علم مجھے ان ہی

کے ذریعہ ہوا۔ طرز کلام میں شگفتگی کے ساتھ ایک عرفانی کیفیت بھی رچی ہوئی ہوتی تھی جو ان کے ذکر اللہ کا اثر تھا، موزونیٔ طبع کے تحت کبھی کبھی اشعار بھی کہہ لیا کرتی تھیں، چنانچہ ۱۳۶۸ھ میں ان کا جب پہلا حج میرے ساتھ ہوا تو اپنے ذوق وشوق اور حج وزیارت کے ولولہ میں اپنے جذبات اور دعاء والتجا کے کلمات نظم کیے لیکن افسوس ہے کہ یہ نظم دستیاب نہیں ہوسکی۔

ان کی نظموں میں سے صرف دو نظمیں ہاتھ لگی ہیں جو اتفاق سے بچوں نے اپنی کاپیوں میں نقل کرلی تھیں، ایک میرے بہنوئی سید محمد محتشم مرحوم اور ان کے حقیقی بھائی سید محترم مرحوم کے واقعہ شہادت پر لکھی جو ۲؍ستمبر ۱۹۴۷ء میں پیش آیا۔

سید محمد محتشم مرحوم ان کے نندوئی بھی تھے اور سمدھی بھی، ان کے لڑکے اور میرے حقیقی بھانجے سید محمد احتشام کاظمی سلمہٗ سے مرحومہ نے اپنی چھوٹی لڑکی برخوردار حُمیرا خاتون سلمہا کا نکاح کیا تھا، اس لیے دونوں بھائیوں کی بیک دم شہادت پر بہت متاثر تھیں اور بطور مرثیہ چند اشعار نظم کیے جن کا عنوان انہوں نے خود ہی ''تاثراتِ الم'' تجویز کیا تھا۔

پھر ۱۳۹۰ھ میں اپنے سب سے چھوٹے لڑکے برخوردار محمد اعظم سلمہٗ حال لکچرر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی شادی کے موقعہ پر اس کا سہرا بھی انہوں نے نظم کیا اور اس وقت خاندان کے مرد اور عورتوں کے بھرے مجمع میں سنایا تھا، اور اس کا عنوان بھی خود ہی ''مامتا کے پھول'' تجویز کیا تھا۔

جدی طور پر چونکہ مرحومہ کے گھرانے میں طب اور مطب کے سلسلے قائم رہے اس لیے طبی مسائل میں بھی خاصا دخل تھا اور اپنے بچوں کی معمولی تکالیف کا علاج خود ہی کرتی تھیں، حتی کہ بعض اوقات طبیب دارالعلوم جناب حکیم محمد عمر صاحب پرنسپل جامعہ طبیہ دارالعلوم کے نسخوں پر بھی تنقید کردیتی تھیں اور بعض امور میں حکیم صاحب ممدوح ان کی تنقید کو قبول کرکے نسخوں میں ترمیم بھی کردیا کرتے تھے۔

خانگی اور خاندانی معاملات میں ان کی رائے نپی تلی ہوتی تھی اور اکثر خاندان کی

خواتین اپنے گھریلو معاملات میں انہیں کی رائے کو مدارِ کار ٹھہراتی تھیں۔

دیو بند کی ہر برادری کی خواتین ان سے مانوس اور وابستہ تھیں اور تقریباً روزانہ مغرب سے عشاء تک عورتوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، اولاد کی تربیت کا ایک خاص سلیقہ حق تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا، زبان سے زیادہ طرزِ عمل سے اولاد کو صحیح راہ پر ڈالتے رہنے کا خاص ملکہ تھا، اسی کا اثر تھا کہ ساری اولاد پسری اور دختری، داماد اور دلہنیں صرف ان سے ہی وابستہ اور ان پر شیفتہ اور ان کی مطیع نہ تھیں بلکہ باہم بھی آپس میں شیر وشکر اور ایک دوسرے سے محبت اور شگفتگی کے ساتھ وابستہ رہیں، جس کے اثرات الحمدللہ آج بھی بدستور قائم ہیں۔

عام طور سے ساس بہو کی ناچاقیاں دنیا میں ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن یہ ان کے طرزِ معاشرت اور رہن سہن کے ڈھنگ کا اثر ہے کہ اس گھرانے کا ذہن اس کے تصور تک سے ناآشنا رہا جس کے آثار بدستور قائم اور الحمدللہ ترقی پذیر ہیں۔

حق تعالیٰ نے انہیں ہر حیثیت سے خوش نصیب بنایا تھا اور ان کی مقبولیت اپنے ہی وطن حد تک محدود نہیں تھی بلکہ بیرونی ممالک میں بھی جہاں جہاں ان کا جانا ہوا وہاں بھی وہی مقبولیت پیدا ہوتی رہی اور قائم رہی، ہندوستان کا کوئی قابلِ ذکر شہر ایسا نہیں ہے جہاں ان کا سفر میرے ساتھ نہ ہوا ہو اور انہیں مستقل دعوت نہ دی گئی ہو، اور جہاں بھی جانا ہوتا تھا وہاں کی خواتین ان کے اخلاق اور طرزِ سخن سے متاثر ہو کر ان کی گرویدہ ہو جاتی تھیں اور بار بار ان کو دعوت دیتی تھیں۔

بیرونی ممالک میں برما کے ایک سفر کے بعد حجاز اور پاکستان کے متعدد سفر ہوئے اور ہر جگہ کے متعارف طبقہ نسواں کی گرویدگی ان کے ساتھ رہی، پاکستان کا کوئی بڑا شہر ایسا نہیں رہا جس کا سفر انہوں نے نہ کیا ہو اور وہاں کی خواتین کا حلقہ ان کا مداح اور گرویدہ نہ ہو گیا ہو۔

برما میں مانڈلے اور مومین وغیرہ میں خواتین کے مجمعوں نے غیر معمولی طور پر ان کا خیر مقدم اور اجتماعی طور پر استقبال کیا، ہوائی اڈوں پر آئیں اور انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا،

ان کی سیر وتفریح اور باتیں سننے کے لیے مستقل پروگرام بنائیے، یہی صورت پاکستانی شہروں میں بھی رہی، زاہدان (ایران) سے دعوت آئی، اور میرے ساتھ ان کا سفر متعین ہوگیا، پروگرام یہ تھا کہ ایران کے راستہ سے عراق ہو کر اور مقاماتِ متبرکہ کی زیارت کرتے ہوئے عمرہ کے لیے حجاز حاضری ہوگی لیکن اسی زمانہ میں ان کے سفر آخرت کی تیاری شروع ہوگئی اور بوجہ مرضِ موت یہ سفر نہ ہوسکا۔

اولاد کی طرف سے بھی حق تعالیٰ نے انہیں خوش نصیب بنایا تھا۔ انہوں نے اپنی تین پشتیں اپنی زندگی میں پروان چڑھتے دیکھیں، بیٹے بیٹیاں، پوتے، نواسے اور ان کی اولادیں، انہوں نے خوشیوں اور مسرتوں کی فضائیں دیکھیں، خود اپنی ساری اولاد کی شادی بیاہ اور کافی حد تک اولاد کی اولاد کی تقریبات وغیرہ سے اپنی زندگی ہی میں فراغت پائی تھی اور یہ کم خوش نصیبی نہیں کہ ان کے انتقال تک ان کی اولاد اور اولاد در اولاد کا عدد ماشاء اللہ چوالیس تک پہنچا ہوا تھا، کثرھم اللہ تعالیٰ و ابقاھم ۔ اور وہ سب سے ٹھنڈے سینے دنیا سے رخصت ہوئیں اور اولاد ساری مطیع اور فرمانبردار چھوڑی۔

ان کا مرضِ موت انتقال سے تقریباً چھ سات ماہ پہلے رجب ۱۳۹۴ھ سے شروع ہوا، ابتداءً معمولی تکلیف معدہ کی رہی، احتباسِ ریاح کے سبب قلتِ اشتہاء سے مرض کا آغاز ہوا، رفتہ رفتہ معدے سے جگر نے اثر قبول کیا، ضعفِ جگر پیدا ہوا اور تین چار ماہ بعد اس میں ورم جگر کی صورت پیدا ہوگئی۔ پھر ورم نے تحجر کی صورت اختیار کرلی جس سے صلابتِ جگر کا آغاز ہوا اور اسی صلابت نے بالآخر انتقال سے ڈیڑھ ماہ قبل زخم کی صورت اختیار کرلی جو آخر کار جگر کا کینسر ثابت ہوا۔ مرض لاعلاج تھا تاہم معالجین کی تمام تر سعی یہ تھی کہ کرب اور بے چینی نہ ہو، چنانچہ اس حد تک علاج کامیاب رہا اور باوجود زخم کے اندرونی پھیلاؤ کے کوئی غیر معمولی کرب و بے چینی نہیں ہوئی اور جس حد تک ہوئی اسے مرحومہ نے صبر و تحمل سے انگیز کیا، کبھی کوئی کلمہ اظہار بے چینی کا ان کی زبان پر نہیں آیا۔ ابتداء مرض ہی سے وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی تھیں اور

اس کا اظہار بھی ابتداءِ مرض ہی میں انہوں نے کر دیا تھا کہ میں اس مرض سے جانبر نہ ہوں گی، یہ بھی کئی بار کہا کہ مجھے موت کی فکر نہیں وہ تو بہر حال آنی ہے فکر اس کی ہے کہ خالی ہاتھ ہوں، میں ہنس کر کہہ دیتا تھا کہ تمہارے ہاتھ کہاں خالی ہیں ہزار دانہ کی تسبیح سے تو ہر وقت تمہارا ہاتھ بھرا رہتا ہے۔

بہر حال یہ تکلیف بڑھتی رہی، ذیقعدہ اور ذی الحجہ میں اشتہاء بالکل ساقط ہوگئی، دو چار گھونٹ چائے کے سوا غذا کچھ نہ رہی جس سے ضعف کا بڑھنا قدرتی تھا، علاج کی دوڑ دھوپ کافی ہوئی۔ سہارنپور، دہلی، میرٹھ، بریلی لے جا کر یونانی اور ڈاکٹری، ہومیوپیتھک وغیرہ ہر قسم کے معالجے ہوتے رہے، بیرونی اطباء بھی بلائے جاتے رہے اور آخر کار مستقل علاج عزیز محترم مولوی حکیم محمد سعود سلمہ ابن حضرت محترم مولوی حکیم محمد مسعود صاحب گنگوہی کا رہا، مگر ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اس ضعف اور نقاہت میں آخر کے دو ماہ ذی قعدہ اور ذی الحجہ میں فرائض و واجبات کے سوا معمولات کی سکت باقی نہ رہی، ابتداءً نماز بیٹھ کر ادا ہوتی رہی، جب بیٹھنے کی بھی طاقت باقی نہ رہی تو لیٹ کر اشاروں سے ہوتی رہی اور اس میں مختلف اوقات میں جب غفلت طاری ہوتی تو غیر شعوری اور غیر اختیاری طور پر بار بار نماز کی نیت باندھنے کے لیے ہاتھ اٹھتے اور گر جاتے، آٹھ اور نو محرم دو دن کلیتاً غشی طاری رہی یہاں تک کہ دس محرم ۱۳۹۴ھ یوم عاشورہ کو شب میں تقریباً ساڑھے گیارہ بجے دس بارہ منٹ کے نزع کے ساتھ دمِ آخر ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ہر آنکہ زاد ناچار بایدش نوشید
زجام دہر مئے کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ

انتقال کی خبر سے قصبہ کی ہر سمت کی عورتیں اور بالخصوص اعزہ و اقارب کی مستورات کا صبح ہی سے ہجوم ہوگیا تھا، فون کی اطلاع سے دہلی، میرٹھ، مظفر نگر، سہارنپور سے متعدد اکابرِ ملت

اسی دن دیوبند پہنچ گئے۔ غسل حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ محترمہ نے دیا، جن سے مرحومہ کو اور مرحومہ سے ان کو بہت گہرا اور خصوصی تعلق تھا۔ نمازِ جنازہ میں دو ڈھائی ہزار علماء، صلحاء، طلباء اور بہت سے بیرونی حضرات شریک تھے اور ہر ایک نے اس تصور سے نماز ادا کی کہ جیسے وہ خود اپنی ماں کے جنازے میں شریک ہیں، جنازہ کو کندھا دینے میں بھی ہر ایک کی بالخصوص طلبائے دارالعلوم کی سعی پیش قدمی کی تھی، جس سے جنازہ بہت رک رک کر دیر سے قبرستان تک پہنچ سکا، مکان سے ملحقہ بازار بند ہوگیا اور ہر دوکاندار نے یہی کہا کہ آج ہماری ماں کا انتقال ہوگیا ہے، الیکشن کے حلقوں نے اس دن پروپیگنڈہ اور لاؤڈ اسپیکر سب روک دیئے دارالعلوم میں بھی پورے دو دن تعطیل رہی اور برابر ختم قرآن وکلمہ طیبہ میں حضرات اساتذہ وطلبہ شغف کے ساتھ شریک ہوئے اور پورے دارالعلوم کا ایک عظیم جلسۂ تعزیت دارالحدیث کے ہال میں منعقد ہوا۔ جس میں تمام اساتذہ، طلبہ اور اہل دفاتر نے شرکت کی اور تجویز تعزیت پاس کی۔

دارالعلوم کے ہر شعبہ نے الگ الگ بھی مجالس ختم منعقد کیں اور جلسہ ہائے تعزیت کر کے تجاویز تعزیت بھجوائیں۔ مقامی حکام اور مختلف پارٹیوں کے ذمہ دار حضرات تعزیت کے لیے آتے رہے۔ بی، کے، ڈی پارٹی کے ممبران کا تحریری تعزیت نامہ اس کے متعدد ممبران خود لے کر آئے، جب کہ دارالعلوم میں ختم قرآن شریف کا اجتماع ہو رہا تھا۔ ملکی ہائی کمان کی طرف سے مسز اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند، مرکزی حکومت کے وزیر داخلہ شری دکشت سابق وزیر اعلیٰ کیرالا وحال ممبر پارلیمنٹ شری اجیت پرشاد جین، گورنر یوپی مسٹر اکبر علی خاں، وزیر اعلیٰ یوپی مسٹر بھوگنا، ڈپٹی اسپیکر ہریانہ اسمبلی اور متعدد ممبران پارلیمنٹ نے تحریری پیغاماتِ تعزیت بھیجے۔ ہندوستان کے عام مدارس میں تعطیلات کر دی گئیں اور ختم قرآن وایصال ثواب کا اہتمام کیا گیا، ملک کی مختلف سیاسی وغیر سیاسی انجمنوں نے تجاویز تعزیت ارسال کیں۔

بہر حال ان کا صدمہ ملک گیر طریق پر محسوس کیا گیا، تعزیتی تار اور خطوط بہت کثیر تعداد

میں موصول ہوتے رہے۔ جن کی کئی مسلیں بن گئیں جو ملک گیر پیمانہ پر متعارف دینی اور اخلاقی حلقوں میں ان کے صلاح وتقویٰ سے اس رابطہ کی دلیل ہے کہ جو ہر قلب میں جا گزیں تھا۔ حجاز مقدس، حرمین شریفین میں بھی ایصال ثواب ہوا، متعدد مخلصین نے بہ نیتِ ایصال ثواب عمرے بھی کیے۔ غیر ممالک سے بھی جو خطوط اور تار تعزیت کے سلسلے سے آئے ان میں مرقوم ہوتا تھا کہ امی جان کے انتقال سے ہم سب دلگیر ہیں، عام طور پر ملک اور بیرون ملک میں سب انہیں امی جان ہی کے لقب سے یاد کرتے تھے، وہی لقب تعزیت میں بھی استعمال ہوتا رہا۔

بطن کی بیماری اور وہ بھی خون آلود ہونے کی وجہ سے ان شاء اللہ مرنے کے بعد حسب بشارتِ نبوی مقام شہادت سے ہمکنار ہوئیں، انتقال کے دن اطراف و جوانب کے متعدد عزیزوں اور دوستوں نے خواب میں دیکھا کہ انتقال ہوگیا اور اس پر ہی بہت سے دوست احباب سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ، دہلی، وغیرہ سے چل پڑے اور دیوبند پہنچ گئے۔ انتقال کے بعد بہت سے لوگوں نے مبشرات (سچے خواب) بیان کیے جو انشاء اللہ ان کی وہاں کی مقبولیت کی علامت ہے۔

میرا تاثر قدرتی تھا اور ساٹھ سالہ رفاقت کے بعد فطری بھی تھا، صبر و تحمل حق تعالیٰ کی دین تھی، تاہم اس تاثر میں یہی واقعاتِ مذکورہ بصورت اشعار بھی بے ساختہ قلم پر آگئے جو مرحومہ کو خطاب کر کے لکھے گئے تھے، ان میں شاعری نہیں ہے اور نہ ہی میں شاعر ہوں، صرف جذبات و تاثرات کی بے ساختہ ترجمانی ہے۔

عزیزں کی مجلس میں کئی بار یہ نظم پڑھی گئی اور سب ہی ہر بار چشم نم ہوتے رہے۔ سب کا اصرار ہوا کہ یہ واقعات منثور اور منظوم ہر عزیز کے پاس بطور یادگار باقی رہیں تو دلوں کی تسلی کا باعث ہوگا، اس لیے یہ نظم اور اس سے پہلے کی یہ نثر کی چند سطریں جو فی الجملہ مرحومہ کے مختصر حالات پر مشتمل ہیں باصرار اعزہ طبع کرالی گئی ہیں جو ہدیہ احباب واعزہ ہیں۔ (بقیہ صفحہ نمبر 72 پر)

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی[1] کی بیوی

(۶) محترمہ آفتابی بیگم

میرے خانگی حادثہ پر بزرگوں، مخلص دوستوں اور عزیزوں کے تعزیتی خطوط کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ان میں سے بعض نے جو بہت ہی دردمندی سے لکھے گئے ہیں، دل میں داعیہ پیدا کیا کہ مرحومہ اہلیہ کے متعلق چند باتیں حوالہ قلم کروں۔ جن کے بارے میں امید ہے کہ ان شاء اللہ ان سے واقفیت اللہ کے بہت سے بندوں اور بندیوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسنِ ظن اور اس کے کرم پر اعتماد ویقین میں اضافہ کا ذریعہ اور خود مرحومہ کے لیے بھی انشاء اللہ خیر ورحمت کا وسیلہ بنیں گی۔

مرحومہ رفیقۂ حیات کی حیثیت سے تقریباً ۲۸ رسال میرے ساتھ رہیں، اس پوری مدت میں برابر یہ تجربہ رہا کہ اُن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ خاص فضل کا ہے، اس کا بہت ہی نمایاں ادراک درجہ میں محیر العقول ظہور اُن کے سفرِ حج اور سفرِ آخرت کے بعض واقعات میں ہوا۔ اس وقت اسی سلسلہ کے چند واقعات سپرد قلم کرتا ہوں۔

وہ میرے والد ماجد مرحوم کی حقیقی بھانجی کی لڑکی تھیں، دین دار اور عبادت گزار اپنے بچپن سے تھیں۔ میرے گھر آنے سے بہت پہلے اپنی ابتدائی عمر ہی میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ سے بیعت ہوئی تھیں، پھر حضرت کے وصال کے بعد خود میرے ساتھ سہارنپور حاضر ہو کر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی سے بیعت کی تجدید کی تھی۔ قدرتی طور پر ان کی بڑی آرزو اور تمنا تھی کہ ان کو حج کی سعادت نصیب ہو لیکن اس کا

(۱) مولانا محمد منظور نعمانی ۱۵ ردسمبر ۱۹۰۵ء میں سنبھل اتر پردیش میں صوفی محمد حسین کے یہاں پیدا ہوئے۔ مادر علمی:۔ مدرسہ سراج العلوم ہلالی سرائے سنبھل، دارالعلوم مئو اعظم گڑھ اور دارالعلوم دیوبند، فراغت: ۱۹۲۷ء دارالعلوم دیوبند وفات ۵ رمئی ۱۹۹۷ء لکھنؤ۔ اولاد: مولانا عتیق الرحمن سنبھلی اور مولانا خلیل الرحمن سجاد نعمانی وغیرہ۔

سامان نہ اُن کے پاس تھا نہ میرے پاس اور وہ اس لحاظ سے میرا حال اچھی طرح جانتی تھیں، اس لیے اس سلسلہ میں کبھی انہوں نے مجھ سے ایک حرف بھی نہیں کہا۔ مگر میرے لئے اللہ تعالی نے محض اپنے فضل سے کئی بار اس کا سامان فراہم کیا اور پھر ادھر چند برسوں سے رابطہ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ) کی رکنیت کے طفیل تقریباً ہر سال حرمین پاک کی حاضری نصیب ہونے لگی تو میرے جانے کے وقت ان کے دل کا جو حال ہوتا تھا اس کو میں محسوس کرتا تھا لیکن وہ مجھ سے اس سلسلہ میں کبھی کچھ نہ کہتیں، بس اللہ تعالی سے عرض کرتیں۔ پھر اللہ تعالی نے ان کی زندگی کی بالکل آخری مہلت میں یعنی ان کے مرض الموت کے شروع ہونے سے صرف چند ہفتے پہلے بے وہم وگمان بالکل ''لا یحتسبی'' طور پر ان کے اور میرے دونوں کے ہوائی سفر کا ایسے عجیب وغریب طریقہ سے انتظام فرمایا کہ اس کی کوئی توجیہ رب کریم کے خاص الخاص فضل کے سوا نہیں کی جاسکتی۔

اس کے بعد مرحلہ یہ تھا کہ ہم دونوں کے لیے حج والے پاسپورٹ سے سفر کرنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ انٹرنیشنل پاسپورٹ ہی سے سفر کرسکتے تھے اور اہلیہ کے لیے انٹرنیشنل پاسپورٹ حاصل کرنے کا کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔ اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر اندیشہ بلکہ گمان یہی تھا کہ پاسپورٹ جلدی نہ مل سکے گا اور وقت میں گنجائش بالکل نہیں تھی۔ لیکن اللہ تعالی کی کارسازی کہ حیرت انگیز طریقہ پر صرف تین چار دن میں ان کا پاسپورٹ تیار ہوا اور مل گیا۔

اس کے بعد دوسرا مرحلہ یہ سامنے آیا کہ انٹرنیشنل پاسپورٹ سے سفر کرنے والوں کو صرف ۶۵ روپے ساتھ لے جانے کی اجازت ہوتی ہے جو ہم جیسوں کے لیے جدّہ کے ہوائی اڈہ پر اترنے سے مکہ مکرمہ پہنچنے تک کے لیے بھی مشکل ہی سے کافی ہوسکتے تھے۔ اس مسئلہ نے اچھا خاصا تردد پیدا کیا، لیکن اللہ تعالی نے رہنمائی فرمائی اور ہم نے اپنے دل سے کہا کہ اس سفر کا انتظام رب کریم نے محض اپنے لطف وکرم سے فرمایا ہے اس لیے بس اسی کے لطف وکرم پر بھروسہ کرکے چلنا چاہیے چنانچہ ایسا ہی کیا اور پھر پورے سفر میں اس کا بے

حساب لطف وکرم شامل حال رہا اور ہاتھ بالکل خالی ہونے کے باوجود وہ راحتیں اور نعمتیں نصیب رہیں، جو کبھی کسی سفر میں میسر نہ ہوئی تھیں اور جن کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔ بالکل ایسا معاملہ رہا گویا گھر سے قدم نکالتے ہی کسی کریم میزبان نے اپنی مہمانی میں لے لیا ہے۔

حج کے مسافروں کی پہلی منزل بمبئی ہوتی ہے، وہاں ہم جیسے لوگوں کے لیے قیام کی اچھی سے اچھی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ کوئی مخلص دوست اپنا مہمان بنالے اور خود تکلیف اٹھا کے اپنے گھر کے کسی حصہ میں ٹھہرالے، لیکن اللہ تعالیٰ کے کرم نے اس سفر میں اس سے بہت زیادہ آرام دہ انتظام یہ فرمایا کہ ہمارے نہایت مخلص دوست حاجی احمد صاحب (زمزمی) نے ہمیشہ کے معمول کے مطابق مہمان تو اپنا بنایا لیکن اپنے گھر میں قیام کی دلی خواہش کے باوجود خاص کر اہلیہ کی راحت کے خیال سے اپنی خوش دامن صاحبہ کے وسیع مکان میں قیام کرایا جو خود اُس وقت حج پر گئی ہوئی تھیں اور اپنا وہ مکان پورے ساز وسامان کے ساتھ حاجی صاحب موصوف ہی کے سپرد کر گئی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بمبئی میں قیام کے ایسے آرام دہ انتظام کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بلاشبہ یہ محض فضل ربی تھا۔ پھر بمبئی کے احباب ومخلصین کے گھروں کی خواتین نے اُن کی آمد کو گویا ایک تقریب بنالیا اور ان کے ساتھ انتہائی خلوص ومحبت اور اکرام کا معاملہ کیا۔ پھر جدّہ پہنچنے پر مخلص مکرم الحاج محمد ولی عبداللہ نورولی اور ان کے اہل خانہ نے ایسی ہی میزبانی کی۔ بلاشبہ یہ سب اللہ تعالیٰ ہی کا فضل وکرم اور اسی کی طرف سے تھا۔

میں نے مکہ معظمہ میں مدرسہ صولتیہ میں قیام کرنا طے کیا تھا، مجھے معلوم تھا کہ ایام حج میں ہندوستان و پاکستان کے سینکڑوں حجاج جن میں خواص کی بھی اچھی خاصی تعداد ہوتی ہے صولتیہ میں قیام کرتے ہیں۔ اس لیے سوچ لیا تھا کہ بس گزارے کی جگہ پر قناعت کرنا ہوگا اور اس مجاہدہ کے لیے دل پوری طرح بلکہ خوشی کے ساتھ آمادہ ومطمئن تھا۔ لیکن جب ہم لوگ مدرسہ پر جا کر اترے تو معلوم ہوا کہ مدرسہ کے خاص دفتر کے اوپر جو ایک صحن دار اور ہم جیسوں کے لیے نہایت آرام دہ کمرہ حال ہی میں بن کر تیار ہوا ہے۔ ہمارے عنایت فرما

حضرت مولانا شیخ محمد سلیم صاحب نے (جو مدرسہ کے سربراہ ہیں) وہ ہمارے لیے مخصوص کر رکھا ہے، فوراً ہمارا سامان وہیں پہنچوا دیا گیا، خود ہم پہونچے تو دیکھا کہ اس کمرہ میں رہائش ہی کے نہیں بلکہ آسائش کے بھی ضروری سامان ہمارے لیے پہلے سے فراہم کر دیے گئے ہیں پلنگ بچھے ہوئے ہیں، ان پر ہمارے لیے بستر بھی لگے ہوئے ہیں الغرض وہ سب کچھ تھا جو راحت کے لیے ضروری تھا اور جس کا پہلے سے وہم وگمان نہیں تھا۔ ہم دونوں اپنا سامان کمرہ میں رکھنے کے بعد عمرہ ادا کرنے کے لیے حرم شریف جانے لگے، مرحومہ اہلیہ میرے پیچھے پیچھے تھیں، حضرت مولانا شیخ محمد سلیم صاحب کے پاس سے گزر ہوا تو میں نے اُن کی اس غیر معمولی عنایت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے دلی احساس وتاثر کا اظہار کیا تو مولانا نے حسب عادت بڑی صفائی کے ساتھ فرمایا، مولانا! سچی بات یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہوا ہے۔ آپ کے لیے اور آپ کی خاطر بالکل نہیں ہوا، آپ تو آتے ہی رہتے ہیں، بلکہ ان کے لیے کیا گیا ہے جو آپ کے ساتھ آئی ہیں، خدا ہی جانتا ہے کہ کبھی پھر آئیں گی یا نہیں۔

ایک نہایت مخلص دوست قاری محمد سلیمان صاحب نے (جو اصلاً سورتی ہیں لیکن مکہ معظمہ میں مقیم ہیں) مولانا شیخ محمد سلیم صاحب سے اجازت لے کر ہم دونوں کو اپنا مستقل مہمان بنالیا اور سوائے ان دنوں کے جب کہیں خصوصی دعوت ہوتی روزانہ ممدوح کے یہاں سے کھانے کا خوان ہمارے کمرہ میں آتا رہا اسی طرح مدینہ طیبہ کے پورے زمانہ قیام میں ایک دوسرے نہایت عزیز دوست صوفی محمد اقبال صاحب نے ہم دونوں کی میزبانی کی۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے اُس پورے سفر میں وہ سہوتیں اور راحتیں نصیب فرمائیں جو اس سے پہلے کسی سفر میں نصیب نہیں ہوئی تھیں اور جن کا وہم وگمان بھی نہیں تھا۔

ان سب سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ یہ ہوا کہ اگر چہ مرحومہ کی عمر سفر حج کے وقت پچاس سال سے کچھ ہی زیادہ تھی لیکن وہ فطری طور پر بہت کمزور تھیں اور کئی برس پہلے سے اُن کے ضعف جسمانی اور ناتوانی کا حال یہ تھا کہ اگر ان کو سودوسو قدم بھی پیدل چلنا پڑ جاتا تو اختلاج کی سی کیفیت

ہو جاتی اور سانس کا نظام بگڑ جاتا اور بہت دیر تک آرام کرنے کے بعد حالت درست ہو پاتی اور کبھی کبھی دوا استعمال کرنے کی ضرورت پڑ جاتی۔ اس لیے میرا خیال تھا کہ یہ بے چاری حج اور عمرہ کے سلسلہ میں طواف بھی بہ مشکل کر سکیں گی اور صفا و مروہ کے درمیان سعی تو سواری ہی سے کر سکیں گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اس کے فضل خاص کا معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ مکہ معظمہ پہونچتے ہی اُن میں وہ توانائی آگئی جو شاید کبھی جوانی میں رہی ہو۔

جدّہ سے بذریعہ کارروانہ ہو کے ہم لوگ مدرسہ صولتیہ پہونچے تھے، سامان اپنے کمرہ میں محفوظ کر کے وضو وغیرہ سے فارغ ہو کر عمرہ ادا کرنے کے لیے حرم شریف کو چلے، مدرسہ سے حرم شریف کا فاصلہ تقریباً تین فرلانگ ہے، میں نے مدرسہ سے باہر سڑک پر آ کر اُن کی وجہ سے ٹیکسی کرنی چاہی، انہوں نے کہا کہ ہم پیدل ہی چلیں گے لیکن چونکہ مجھے یقین تھا کہ یہ نہیں چل سکیں گی اس لیے میں نے اُن کی بات نہیں مانی اور ٹیکسی سے ہم دونوں حرم شریف گئے، وہاں پہونچ کر پہلے طواف کیا، طواف کے بعد ہم سعی کے لیے صفا پر آئے، وہاں وہ ہاتھ گاڑیاں کھڑی رہتی ہیں جن پر وہ بے چارے ضعیف اور معذور لوگ کرایہ ادا کر کے سعی کرتے ہیں جو پیدل چل کر نہیں کر سکتے۔ میں نے اہلیہ سے کہا کہ تم گاڑی سے سعی کر لو، انہوں نے کہا کہ نہیں میں پیدل ہی کروں گی! میں نے بھی اللہ تعالیٰ کا یہ فضل دیکھ کے طواف کے سات چکروں کا اور پھر مطاف سے پہلے صفا تک آنے کا ان پر ذرا بھی اثر نہیں پڑا، یہی مناسب سمجھا کہ وہ اگر کر سکیں تو میرے ساتھ پیدل ہی سعی کر لیں، چنانچہ انہوں نے پوری سعی میرے ساتھ پیدل کی، اور ان پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا، حالانکہ سعی کے ساتھ پھیروں کی مسافت پونے دو میل کے قریب ہو جاتی ہے پھر اس کے بعد وہ میرے ساتھ پیدل ہی مدرسہ صولتیہ واپس ہوئیں۔ پہلے دن کے اس تجربہ کے بعد مجھے احساس ہو گیا کہ یہ ان پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے پھر تو مکہ معظمہ کے پورے زمانہ قیام میں یہ معمول رہا کہ وہ اکثر پانچوں وقت کی نماز کے لیے میرے ساتھ پیدل حرم شریف آتیں اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بالکل تندرست خواتین کی طرح بکثرت نفلی طواف بھی کرتیں۔

مدینہ طیبہ میں ہمارا اقیام عزیز محترم صوفی محمد اقبال صاحب کے پاس باب التمار میں تھا، وہاں سے مسجد نبوی کا فاصلہ بھی قریب قریب اتنا ہی ہے جتنا کہ مکہ معظمہ میں مدرسہ صولتیہ سے حرم شریف کا فاصلہ ہے، وہاں بھی وہ نمازوں کے اکثر اوقات میں میرے ساتھ پیدل ہی مسجد آتیں، ہم دونوں بار بار اللہ تعالیٰ کے اس فضل و انعام کو یاد کرتے اور اس کا شکر ادا کرتے۔

مجموعی طور پر تقریباً چالیس دن حرمین پاک میں قیام رہا۔ انہیں ایک دن بھی اس ضعف و ناتوانی کا احساس نہیں ہوا جو برسوں سے لازمہ زندگی بنا ہوا تھا، بمبئی واپسی تک یہی حال رہا، البتہ بمبئی سے لکھنؤ آتے ہوئے ٹرین ہی میں محسوس ہوا کہ اس کیفیت میں کمی آرہی ہے۔ پھر گھر پہنچنے کے چند ہی روز بعد وہ اپنے پچھلے حال پر واپس آگئیں اور معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح غیر معمولی طور پر اپنے خاص الخاص فضل سے اُن کے سفر کا سامان فراہم کر کے ان کی ایک بڑی آرزو اور تمنا پوری کی تھی اسی طرح خارق عادت طور پر اُن کو صرف سفر حج کے لیے یہ طاقت اور توانائی بخش دی گئی تھی۔

پھر چند ہی روز کے بعد اُن کے اُس مرض کا سلسلہ شروع ہوگیا جس کو ان کی زندگی کے خاتمہ کا ذریعہ بننا تھا اور ۲۶ رشعبان کو ان کے انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ یہ سفر حج در اصل اُن کے سفر آخرت کی تمہید اور اس کی تیاری کا ذریعہ و وسیلہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کے جس فضل و کرم کا تجربہ ان کی زندگی میں اور خاص کر ان کے سفر حج میں ہوا۔ اُس رب کریم سے پوری اُمید ہے کہ سفر آخرت کی ساری منزلوں میں بھی اللہ تعالیٰ کا وہی فضل و کرم مرحومہ کو نصیب رہے گا۔

مرحومہ کے انتقال اور مفارقت کا طبعی صدمہ تو فطری بات ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو حسن ظن اور اس کی شان کرم پر جو اعتماد نصیب ہے، اس کی بنا پر الحمد للہ دل کو یہ اطمینان ہے کہ اس وقت اُن کا اس دنیا سے چلا جانا ہی ان کے لیے بہتر ہوا۔ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے (جب ان کی طبیعت ناساز تھی) فرمایا تھا: لو کان وانا حیٌّ فاستغفر اللہ وأدعو لك (یعنی اے عائشہ!

اگر تمہارا انتقال میری زندگی میں ہوگیا تو میں تمہارے واسطے اللہ سے خوب مغفرت طلب کروں گا اور دعائیں کروں گا) اس حدیث پاک کے اشارہ کے مطابق مرحومہ اہلیہ کے لیے استغفار اور دعا کے اہتمام کی توفیق الحمدللہ اس عاجز کو نصیب ہے اور چونکہ اہل دین کی ایک وسیع برادری سے تعلق ہے اور اللہ والوں سے محبت ہے اس لیے اپنے حلقۂ تعلق و تعارف میں جہاں جہاں بھی ان کے انتقال کی اطلاع ہوئی، اللہ کے مخلص اور صالح بندوں نے اہتمام سے ان کے لیے استغفار فرمایا، اور ایصال ثواب کیا۔ جو سیکڑوں خطوط اس سلسلہ میں اب تک مل چکے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انہیں پڑھ کر خود مجھے مرحومہ پر رشک آتا ہے۔ اہل دین اور اللہ والوں سے تعلق کی انتہا ہی کتنی بڑی برکت ہے، اللہ تعالیٰ اس کی قدر و قیمت سمجھنے کی توفیق دے۔ اگر میرے پاس ساری دنیا کے خزانے ہوتے تو میں ان کو صرف کر کے بھی مرحومہ کے لیے اتنی دعا و استغفار اور اتنا ایصال ثواب نہ کرا سکتا۔ یہ محض للہی دینی تعلق کی برکت ہے کہ اللہ کے لیے بے شمار بندوں نے حرمین پاک تک ان کے لیے مغفرت و رحمت کی دعائیں کیں اور ایصال ثواب کیا۔ مکہ معظمہ سے ایک مخلص عزیز کا خط ملا ہے کہ ان کو جب اس حادثہ کی خبر ملی تو انہوں نے مرحومہ کی طرف سے عمرہ بھی کیا، اور حدیث شریف میں ہے کہ رمضان مبارک میں عمرہ حج کے برابر ہے۔

یہ سب دراصل اللہ تعالیٰ ہی کا مرحومہ پر فضل و کرم ہے اور بلاشبہ بڑی ہی خوش نصیبی کی علامت ہے۔

ان کے انتقال کے سلسلہ میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ اگرچہ ان کی علالت کا سلسلہ تقریباً ڈھائی سال سے سفر حج کے بعد ہی سے جاری تھا اور پہلے کافی عرصہ تک ان کی حالت بہت تشویشناک اور بظاہر مایوس کن رہی تھی لیکن ادھر تقریباً پانچ چھ مہینے سے حالت بظاہر قابل اطمینان حد تک بہتر ہوگئی تھی، ان کے معالج بھی مطمئن تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے لیے ۲۲ رشعبان (۲۴ راکتوبر) کی تاریخ مقرر تھی اور میں نے اس کی شرکت کے لیے روانگی

کا پروگرام بنالیا تھا کہ دو ہی چار دن پہلے دارالعلوم کے دفتر سے اطلاع آئی کہ فلاں وجہ سے مجلس کی تاریخ دو دن مقدم کردی گئی ہے اور اب شوریٰ کا جلسہ ۲۰ رشعبان سے ہوگا، اور دارالعلوم ہی کے فلاں ضروری کام کے لیے مجھے ایک دن پہلے یعنی ۱۹ رشعبان کی صبح تک دارالعلوم پہنچ جانا چاہیے۔ مجھے تاریخ کی یہ تبدیلی (جو ضابطہ کے خلاف بھی تھی) سخت ناگوار گزری اور میں نے وہاں پہنچ کر اس پر سخت احتجاج اور اعتراض بھی کیا، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا انتظام تھا کہ میں مرحومہ کے انتقال سے پہلے مکان پر پہنچ جاؤں اور ان کی دلی آرزو کے مطابق ان کا انتقال میرے سامنے ہو۔ اگر مجلس شوریٰ کی تاریخ میں یہ تبدیلی نہ ہوئی ہوتی تو میں ۲۶ رشعبان کو مرحومہ کے انتقال کے وقت لکھنؤ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ مجھے مجلس کی کارروائی کے سلسلے میں پورے پانچ دن دیوبند میں قیام کرنا پڑا وہاں سے فارغ ہوکر میں سہارنپور حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک شب وروز وہاں قیام کیا۔ جب وہاں سے لکھنؤ کے لیے روانگی کا ارادہ کیا تو حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ نے بالکل خلاف معمول اور خلاف عادت فرمایا کہ اگر کوئی خاص مجبوری نہ ہو تو فلاں مقصد سے دو دن اور ٹھہر جاؤ۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے کوئی ایسی مجبوری نہ تھی کہ میں ایک دو دن مزید سہارنپور قیام نہ کرسکتا، اور حضرت شیخ مدظلہ سے جس طرح کا نیاز مندانہ تعلق ہے، اس کا تقاضا تھا کہ میں دو دن اور حضرت ممدوح کی خدمت میں قیام کا فیصلہ کر ہی لیتا، لیکن اُس وقت بغیر کچھ زیادہ سوچے سمجھے زبان سے یہی نکلا کہ رمضان مبارک شروع ہونے میں دو ہی چار دن باقی ہیں اس لیے چاہتا ہوں کہ میں جلدی لکھنؤ پہنچ جاؤں۔ حضرت سے یہ عرض کرنے کے بعد لکھنؤ روانہ ہونے کے لیے رخصتی مصافحہ کرکے باہر نکل آیا اور اب سوچنے لگا کہ مجھے حضرت کے فرمانے کے مطابق دو دن اور ٹھہر جانا چاہیے تھا لیکن حضرت سے رخصتی مصافحہ کرکے چلا آیا تھا اس لیے لکھنؤ واپسی ہی کا ارادہ کرلیا۔ ۲۶ رشعبان کو میرے لکھنؤ پہونچنے کے صرف ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد جب مرحومہ کے انتقال کا حادثہ پیش آیا تو معلوم ہوا مجلس شوریٰ دارالعلوم کی تاریخ کی خلاف

ضابطہ تقدیم اور حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ کے فرمانے کے باوجود میرا اسہارنپور نہ ٹھہرنا یہ سب منجانب اللہ اس کا انتظام تھا کہ میں مرحومہ کے آخری وقت میں اُن کے پاس موجود ہوں۔ وہ اس کی بڑی آرزومند تھیں۔

جیسا کہ ابھی اوپر ذکر کیا گیا، مرحومہ کی حالت کئی مہینے سے بہ نسبت سابق کافی بہتر تھی اور میں ان کو اسی حال میں چھوڑ کر دیوبند گیا تھا۔ جب ۲۶ رشعبان کو ۱۲ بجے وہاں سے واپس ہو کر مکان پہونچا تو معلوم ہوا کہ ایک دو دن سے درد کی تکلیف ہے جس کا تعلق گردہ سے سمجھا جا رہا ہے۔ اُس وقت بھی میں نے ان کی حالت تشویشناک نہیں سمجھی لیکن تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد اچانک ان کی حالت میں تغیر ہوا غالباً قلبی دورہ ہوا اور صرف چار پانچ منٹ میں روح اور جسم کا رشتہ منقطع ہو گیا۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ درد کی شدید تکلیف کی حالت میں وہ اللہ تعالیٰ سے دُعا اور استغفار کرنے کے ساتھ اپنی بڑی بیٹی کوثر سلمہا سے کہتی تھیں کہ دیکھو کوثر اس کا خیال رکھنا کہ تکلیف کی شدت میں میری زبان سے کوئی غلط کلمہ نہ نکل جائے۔

اللہ تعالیٰ اپنی اس بندی کے ساتھ مغفرت و رحمت کا معاملہ فرمائے، ہر قسم کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرماتے ہوئے حسنات کو قبول فرمائے اور جن بندوں نے ان کے لیے مغفرت و رحمت کی دعائیں کی اور ان کے پسماندگان کی تعزیت کی اور مخلصانہ ہمدردی کا اظہار فرمایا ان کو بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے اور دنیا اور آخرت میں فضل و انعام سے نوازے، یہ عاجز تو دل سے ان حضرات کا شکر گزار اور دُعا گو ہے۔

ماخوذ: وفیات نمبر ماہنامہ الفرقان لکھنؤ، مدیر: مولانا محمد منظور نعمانی سن اشاعت: اپریل، مئی، جون ۱۹۷۷ء

☆......☆......☆

حضرت مولانا محمد انظر شاہ کشمیری (۱) کی بیوی

(۷) محترمہ سنجیدہ بیگم

تیری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتی اگر استوار ہوتا

انسان کی زندگی میں بہت سے خوشی کے موقعے آتے ہیں اور ایسے ہی رنج والم کے لیکن شادی کا تصور بھی عجیب خوش کن ہے جانفزا راحت رساں جب شباب میں آدمی قدم رکھتا ہے اور گھر کے بڑے اس کی شادی کے موضوع پر گفتگو کرتے ہیں تو کیسی جان میں جان آتی ہے ان کی سرگوشیوں کو سنتا ہے اور سنی ان سنی کی کیفیت اپنے پہ ظاہر کرتا ہے لیکن دل میں آرزوئیں کروٹیں لیتی ہیں تمنائیں مچلتی ہیں اور بے چینیاں اور بڑھتی ہیں۔ ع

نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے

منگنی ہوتی ہے تو اور بھی مسرتوں کا دروازہ کھل جاتا ہے شادی کی تاریخ طے ہوتی تو پھر کیا ہی کہنا پھر ایک ایک دن پہاڑ کی طرح گزرتا ہے راتیں اختر شماری میں خدا خدا کرکے وہ دن آجاتا ہے جب عروسی کا لباس زیب بدن ہوتا ہے ایک سہما سہما سا خوف یہ دامن گیر کہ نکاح کی مجلس میں ایجاب وقبول کا مرحلہ کس طرح طے ہوگا یہ تصور بھی جاں گسل، باحیا اور حساس لوگوں کے لیے ہے پھر کیا ہوتا ہے کہ کچھ نہ پوچھیے۔ بہت زمانہ ہوا ایک لطیفہ اخبارات میں نظر سے گزرا تھا حسب حال، مطابق واقع وہ یہ کہ کسی گھر میں شادی ہو رہی تھی تقریب کے ہنگامے

---

(۱) مولانا محمد انظر شاہ کشمیری ابن علامہ انور شاہ کشمیری کی ولادت ۶ دسمبر ۱۹۲۸ء میں شاہ منزل محلہ خانقاہ دیوبند میں ہوئی، مادر علمی: دارالعلوم دیوبند، وفات: ۲۶/اپریل ۲۰۰۸ء دہلی، تدفین: دیوبند، اولاد: مولانا احمد خضر شاہ کشمیری (شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند)

شادی کے چرچے مسرتوں کی بارش، فرحتوں کا جہانِ نو، لڑکی کی رخصتی کا وقت آ گیا ماں رو رہی تھی، باپ آنسو بہا رہا تھا، بہنیں بے قرار تھیں اور سب ہی رشتہ دار و اقرباء حسب مراتب اس نالہ وشیون میں شریک تھے دلہن کا ننھا منا بھائی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا کہ اچانک دولہا کو اندر بلایا گیا تو وہ اور اس کے ساتھی ہنستے ہوئے داخل ہوئے ننھے بھائی نے اپنے باپ سے پوچھا کہ ابا یہ کیا معاملہ ہے ہم سب تو رو رہے ہیں اور دولہا بھائی ہنس رہے ہیں گرگ باراں دیدہ باپ نے جواب دیا کہ ''بیٹا ہمارا آج ہی کا دن رونے کا ہے یہ دولہا میاں تو عمر بھر روئیں گے'' واقعہ یہ ہے کہ بعض شادیاں بجائے خانہ آبادی کے خانہ بربادی کی تمہید ہوتی ہیں اور خصوصاً اس دور میں جہیز کے ہنگاموں نے تو لڑکیوں کے لیے ہلاکت کا ایسا سامان پیدا کر دیا جیسے مذبح میں بھیڑ بکریاں بے دریغ ذبح کی جاتی ہیں، بات تعصب کی نہیں لیکن چودہ سو برس پہلے صحرائے عرب سے جو ایک روحانی آواز بلند ہوئی تھی اس کی گونج ساری دنیا میں سنی گئی لیکن کچھ نے عمل کیا کچھ نے سنی ان سنی کر دی۔ آپ نے فرمایا تھا کہ ''اس نکاح میں سب سے زیادہ برکت ہوگی جس میں اخراجات کا بوجھ کم سے کم خود پر ڈالا گیا ہو۔ افسوس تو یہ ہے کہ اس نبی جلیل کے امتی بھی اب جہیز کی لعنت میں گرفتار ہوتے چلے جا رہے ہیں بہر حال یہ باتیں بلا ارادہ قلم پر آ گئیں۔

میں بھی بچہ سے جواں ہوا اور اب جوانی سے بڑھاپے کی طرف بڑھ رہا ہوں سر پر شفیق سایہ صرف والدہ مرحومہ کا تھا اور آگے پیچھے نکاح شادی کے معاملات طے کرنے والا کوئی نہ تھا مطالعہ کا پرانا رسیا ہوں چند موضوعات کو چھوڑ کر جس طرح کی کتاب مل جائے دیکھ ڈالتا ہوں عمل کی توفیق نہ ہوئی اور نہ ہونے کی امید کسی کتاب کے مطالعہ کے دوران شکسپیئر کا یہ مقولہ نظر سے گزرا کہ ''شادی انسانی زندگی میں کھلنے والا ایک نیا دروازہ ہے جس میں سوچ سمجھ کر داخل ہونا چاہیے، پھر میں اپنے اس تجربہ کو غلط نہیں کہہ سکتا کہ خاندانی قومی مناسبتیں اچھل کر سامنے آتی ہیں سو تمنا یہی تھی کہ کسی بڑے باپ کی بیٹی سے شادی ہو اور ماضی چوں کہ لشتم پشتم گزرا تھا مستقبل کی تعمیر کے سنہرے خواب دیکھتا اور اپنی عقل کے مطابق یہ فیصلہ کرتا کہ شاید

سسرالی رشتے ہی آنے والی زندگی میں بہترین مددگار ثابت ہوں پھر میں ایسا سکہ تھا جس کا چلن تو ختم ہوگیا تھا لیکن بہرحال چاندی کھری تھی یعنی والد مرحوم علامہ انور شاہ کشمیریؒ مرحوم کی نسبت عالی ادھر طالب علمی ایک امتیاز کے ساتھ گزری تھی اور طالب علمی ہی سے مقرر بھی ہوگیا تھا اور لکھنے پڑھنے کا الٹا سیدھا قرینہ بھی آگیا تھا مضامین چھپنا کیا بات بعض ماہناموں کی ادارت بھی کرتا دیوبند میں بھی بڑے گھرانے تھے معزز خاندان تھے، باحیثیت خانوادے تھے بلکہ بعض باوقار گھروں سے پیش کش بھی ہوئی لیکن والدہ مرحومہ خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کچھ بڑے گھرانوں کا تجربہ کر چکی تھیں اور اب آکر وہ یہاں رکی تھیں کہ کسی غریب بچی سے میری شادی کی جائے۔گویا کہ ان کے تلخ تجربات کا اور آئندہ کے لیے اقدام کا تختۂ مشق میں ہی بننے والا تھا بڑی کشمکش رہی میری والدہ مرحومہ شفقتوں کی ہمالہ بھی تھیں اور مزاج کی جرنیل بھی، نوازنے پر آتیں تو اپنا سب کچھ لٹادیں، بگڑتیں تو منائیں نہ منیں، میں دارالعلوم میں مدرس ہو چکا تھا لیکن ان کے جلال سے ہمیشہ مرعوب رہا پھر الحمدللہ دینی تعلیم نے ماں باپ کا احترام بھی دل و دماغ میں جاں گزیں کر دیا تھا انہوں نے بجنور میں ایسی لڑکی تلاش کر نکالی جو غریب نان شبینہ کی محتاج اور وقت گزاری کے لیے دوسروں کی دست نگر، میں بڑا گھبرایا، تھرایا لیکن والدہ مرحومہ کے عصائے موسوی نے ادھر ادھر نہیں ہونے دیا بے تکلف عرض ہے کہ ایک دن کھانا کھاتے ہوئے اسی موضوع پر انہوں نے مجھ سے گفتگو کی تو میں نے دیوبند کے ایک بہت ہی باحیثیت گھر کی نشاندہی کی، خشمگیں ہستی خشم ناک ہوگئی بے تکلف لکڑی لی اور اس وقت تک جس کمر پر دستِ شفقت پھرتا تھا لکڑی بجتی رہی تاوقتیکہ اپنی پسندیدہ جگہ کے لیے مجھ سے زبردستی تائید نہیں لے لی بجنور میں میری ہمشیرہ کی شادی ہوئی ہے اور میرے بہنوئی کی یہ میری مخطوبہ حقیقی بھتیجی تھی بہن کی وجہ سے بجنور آمدورفت رہتی ایک دن عورتوں کی جانب سے تقریر کا مطالبہ ہوا تقریر ہوئی تو یہ مخطوبہ جواب مرحومہ ہے سامنے آکھڑی ہوئی، رشتہ دیا گیا، طے ہوگیا شادی کا بھی وقت قریب آگیا لیکن کبھی میں اپنے

مستقبل کو سوچتا تو جی چاہتا کہ صاف صاف انکار کر دوں، کبھی اس معصوم اور مسکین لڑکی کا خیال آتا تو مقتل میں اپنے پاؤں سے جانے کی ہمت پیدا ہو جاتی اسی کشمکش و پنج میں وقت گزر رہا تھا کہ بہن کی شدید علالت کی بجنور سے اطلاع آئی، برسات کا زمانہ تھا، بھاگم بھاگ میں کسے کپڑے لتے کا ہوش اور پھر والدہ مرحومہ کی بے قراری جو کپڑے پہن رکھے تھے ان ہی میں والدہ کے ساتھ نکل گیا، بجنور تک دل بلیوں اچھلتا رہا کہ دیکھیے بہن کیسی ہوں؟ ناسوتی زندگی میں ملاقات ہوگی یا نہیں، الحمد للہ بس اسٹینڈ پر پہنچتے ہی معلوم ہوا کہ داخل ہسپتال ہیں اور بچہ بعافیت پیدا ہو گیا بجنور میں موسلا دھار بارش تھی میں پاؤں میں پشاوری چپل پہنے ہوئے تھا جس کی وجہ سے کیچڑ اڑ اڑ کر میری پشت تک پہنچا پائجامہ لت پت جب والدہ مرحومہ کو بہن کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو انہیں اپنا پرانا منصوبہ یاد آگیا۔

غریب بچی بیوہ کی لڑکی، نہ کوئی آگے نہ پیچھے، انہیں بروقت شادی سے کیا انکار ہوتا۔ چنانچہ قبیل عصر میں سو کر اٹھا تو مجھے بتایا گیا کہ آج ہی بعد مغرب نکاح ہے نہ صرف نکاح بلکہ رخصتی بھی ہے اللہ اللہ کیا شان کی شادی تھی نہ ڈھول نہ تاشے نہ راگ نہ باجے نہ بارات نہ باراتی، نہ رشتہ دار، نہ احباب، سر پر سہرے کا کیا سوال اور گلے میں ہار کہاں سے آتے یہاں دھلی ہوئی پوشاک بھی میسر نہ تھی بس والدہ مرحومہ کی یہ کوشش کہ گھیر گھار کر کسی طرح شادی کر دی جائے کہ یہ قیدی کہیں جیل کی اونچی دیواروں کو پھاند کر فرار نہ ہو جائے، مغرب کے بعد دس پانچ آدمیوں کے اجتماع میں نکاح ہو گیا، بھرپور زندگی کا فیصلہ ایک ہی لمحہ میں مستقبل کی تمام عمارت چشم زدن میں کھڑی ہو گئی کبھی اپنے آلودہ کپڑوں کو دیکھتا کبھی شادی کا خوش کن تصور آتا، کبھی یہ روح فرسا خیال کہ پوری زندگی برباد ہو گئی، کبھی یہ یقین کہ ضعیف والدہ کے حکم کی تعمیل کی ہے اور دینی جذبہ کے تحت خدا تعالیٰ ضائع نہیں ہونے دے گا شب کے گیارہ بجے ہیں اور اب شب عروسی وہ غریب میری بہن کے کپڑے پہنے ہوئے جو اس کے جسم کے مطابق بھی نہ تھے غربت کی ماری لڑکی چھریرا بدن، دبلی پتلی میری بہن کشمیری النسل، قوی ہیکل

نکلتا ہوا قد، بھاری بھرکم تن توش، بے چاری اس غریب بچی پر یہ لباس ایسا محسوس ہوتا جیسے کہ بانس پر کسی نے الٹے سیدھے بے ہنگم انداز میں کمخواب واطلس کے تھان لپیٹ دیئے ہوں۔

میرے جسم پر غلیظ کپڑے، اس کی بے قرینہ پوشاک، بہر حال رات جوں توں گذر گئی، یہ تھی ہماری شب زفاف اور یہ تھی میری بے مزہ شادی، والدہ مرحومہ صورت حال کو بھانپ گئیں اور اب ان کی کوشش یہ تھی کہ وہ ہر طرح اس مرحومہ کی خوبیاں میرے ذہن نشیں کریں میری سرد مہری سے جو مرحومہ کو غم ہوتا تو اس کی دلجوئی میں لگ جاتیں مجھے افسردہ پاتیں تو پھر مجھے خوش کرنے کی کوشش کرتیں، خوب یاد ہے کہ جب ہم بجنور سے دس پانچ دن کے بعد چلے تو ایک سیٹ پر والدہ بیچ میں مرحومہ کنارے میں، والدہ مرحومہ اس سے بولیں کہ اب بجنور چھوٹ رہا ہے اپنے وطن کی سڑکیں اور باغات دیکھ لے، کبھی دو چار جملے خوش کن مجھ سے کہتیں، مگر یہاں ایسی ٹھنڈک تھی جس میں حرارت پیدا ہونے کا کوئی سوال نہ تھا اس غریب کو کوئی گھر لے جانے والا بھی نہ تھا۔ نہ چوتھی نہ بھوڑا کوئی بھی دنیاوی رسم نہ ہونے پائی، صرف ایک بھائی تھا جس نے بڑی جدوجہد کے بعد چار پانچ بیگہ زمین بہم کی تھی زمین دارانہ رقابتیں اسے جہاں آباد میں بہنے والی گنگا ہی میں ڈبو دیا۔ بیوہ ماں اور دو بہنیں رو پیٹ کر صبر کر بیٹھیں۔ اب ازدواجی زندگی کا آغاز ہوا وہ سراپائے وفا، میں مجسم بے مہری و بے وفائی، اس کی جانب سے بھرپور خدمت، میری جانب سے کنارہ کشی اس میں حیا کا اس قدر مادہ کہ کبھی کسی کے سامنے میری چارپائی پر نہیں بیٹھی اور نہ کسی کی موجودگی میں کبھی مجھ سے بات کی، کبھی کبھی تخلیہ میں مجھ سے پوچھ لیا کرتی تھی کہ کیا آپ کو مجھ سے تعلق نہیں اس کا جواب میں صرف ٹالنے کی حد تک دیتا بیس سال کے قریب اس سے رفاقت رہی بچے پیدا ہوئے گھر بھی بنا، اثاثۃ البیت بھی ہوا اور اس غریب کی برکات کا میں نے مشاہدہ کر لیا جس کے یہاں سے مجھے شادی کا ایک جوڑا تو کیا نصیب ہوتا اس کے گھر پر ایک وقت کا کھانا بھی نہیں کھایا پھر الحمدللہ میں نے دوسرے غریبوں کو جوڑے پر جوڑے دیئے خدا تعالیٰ کے فضل سے گھر بھی

متوسط درجہ کا بن گیا اور ضرورت کی کوئی ایسی چیز نہیں جو درمیانہ درجہ کے گھرانہ میں مطلوب ہو اور میرے پاس موجود نہ ہو وہ میری آنکھ بھی بدلے ہوئے دیکھتی تو سہم جاتی بچوں پر میں بگڑتا تو وہ سب بچوں کو لے کر ایک کمرہ میں چھپ جاتی غرض یہ کہ اس نے شرافت وانسانیت میں ایک باوفا بیوی کی حیثیت سے مہر ووفا کا ہر جگہ مظاہرہ کیا چند سال پہلے رات کو میں عشاء کی نماز کے لیے وضو کر رہا تھا بچے سب سو گئے تھے تو وہ مجھے اچانک اپنا ایک بھیانک خواب سنانے لگی خواب یہ تھا۔

''ہمارے گھر میں آگ لگی اور پورے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا''

میں اس خواب کو سن کر سہم گیا تعبیر واضح تھی لیکن میں نے تعبیر نہیں بیان کی وہ میری خاموشی سے گھبرائی اور بار بار سوال کرتی رہی تو میں نے ٹالنے کے لیے کہا کہ کچھ نہیں ریاح کا غلبہ ہے اس لیے تو اس طرح کے خواب دیکھتی ہے مگر میرے سکوت سے اس کا ماتھا ٹھنک گیا یہ شب جمعرات تھی، جمعرات کو میں میرٹھ ایک جلسہ میں شرکت کے لیے چلا گیا جمعہ کو واپس ہوا پانچ چھ روز پہلے اس کے ولادت ہوئی تھی اور وہ زچگی میں تھی جیسے ہی گھر میں داخل ہوا تو بڑی بچی عائشہ جس کی عمر اس وقت سات آٹھ سال کی تھی زار وقطار روتی ہوئی ملی اور پوچھنے پر بتایا کہ امی کی طبیعت بہت خراب ہے میں سیدھا کمرہ میں اس کی چارپائی کے پاس پہنچا، تو اس پر غشی کی کیفیت تھی دماغی سرسام کا شدید حملہ تھا میں نے جا کر آواز دی تو عجیب بات ہے کہ اس نے آواز کا ادراک کر لیا اور اپنے بے چین ہاتھ سے اپنے دماغ کی طرف اشارہ دیا وہ بتا رہی تھی کہ میرا دماغ معطل اور مفلوج ہے بیس سال کی رفاقت کی سرد مہری کا تودۂ برف اب آناً فاناً پگھل رہا تھا معلوم ہوا کہ بیماری سے پہلے اور میرے میرٹھ رخصت ہونے کے بعد اس نے بڑی بچی سے کسی کام کے لیے کہا تھا بچپن کی نادانیاں اس بچی نے صاف انکار کر دیا، تو وہ بولی کہ عائشہ اب گھر کی ذمہ داری تجھے ہی سنبھالنا ہوگی یہ موت کا وہ ادراک تھا جو ہر مومن کو وقت سے پہلے ہو جاتا ہے علاج ومعالجہ میں کوئی کمی نہیں کی گئی

بیماری کی نزاکت کی بنا پر میں نے اس کی والدہ اور بہن کو بجنور سے فوراً بلا لیا تھا بلکہ اپنی بہن اور بہنوئی کو بھی، ہفتہ کا دن گزر گیا تھا شب اتوار کا آغاز تھا میں وہیں بیٹھا ہوا عشاء کے لیے وضو کر رہا تھا جہاں بیٹھ کر اس کا بھیانک خواب سنا تھا اچانک اس کے جسم میں ایک اضطرابی تشنج پیدا ہوا بہن یہ دیکھ کر چلائیں کہ یہ کیا ہوا میں چار پائی کے قریب پہنچا تو وہ اس دنیائے دوں کو چھوڑ چکی تھی قدر نعمت بعد زوال نعمت، اب آنکھوں میں اندھیرا تھا دنیا تاریک تھی گھر اجڑ چکا تھا زندگی برباد ہو چکی تھی۔

پانچ بچیاں اور دو بچے وہ بطور امانت میرے پاس چھوڑ کر بڑی تیزی سے راہ آخرت پر گامزن ہو گئی کسی بچے کی محبت اپنے مخدوم شوہر کا تعلق اپنی بیوہ ماں کی تڑپ اور اپنی بے قرار بہن کی بیتابیاں اسے سفر آخرت سے نہ روک سکیں اسی وجہ سے میں نے ان سطور کا عنوان ''بے مہر محبوبہ'' رکھا، اتوار کی صبح کو آغوش لحد میں اسے سلا دیا گیا جس کے ساتھ میری عافیت، میری راحت، میری خوشی، میری مسرتیں ہمیشہ کے لیے سو گئیں، پیر کے دن صبح کو بعد فجر میں اس کی قبر پر پہنچا تو طلباء کھڑے ہوئے تھے یہ وہی وقت تھا کہ میں صبح گاہی تفریح سے لوٹتا اور وہ میرے لیے ناشتہ تیار کر کے بیٹھتی اب میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا غم واندوہ کا جو طوفان میرے اندر تلاطم پذیر تھا۔ وہ اچانک آنکھوں کی راہ سے اچھل پڑا، میں نے زار وقطار روتے ہوئے اس سے کہا کہ تو یہاں سوتی ہے میرے ناشتہ کا کون اہتمام کرے گا؟ یہاں خواب گراں میں مصروف ہے تیرے بچوں کی خبر گیری کون کرے گا؟ اس کی روح نے جواب دیا جسے میں نے صاف صاف سنا۔

خیال خواب راحت ہے علاج اس بدگمانی کا
وہ کافر گور میں مومن، میرا شانہ ہلاتا ہے

اب موت کی دیوار میرے اور اس کے درمیان حائل ہے برائے نام زندہ ہوں لیکن عہد ہے کہ اس ناسوتی زندگی کے بعد جب اس سے دوسرے عالم میں ملاقات ہوگی تو ضرور

اس سے کہوں گا کہ ”او بے مہر محبوبہ تو تو قبل وقت ہی چلی آئی لیکن میرا معاملہ یہ ہے۔

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

اس کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں جس کی احسن الجزاء خدا تعالیٰ ہی دے گا مگر سب سے بڑا اس کا احسان یہ ہے کہ جب میری والدہ مرحومہ کینسر میں مبتلا ہوئیں تو اس نے ان کی حقیقی بیٹیوں سے بڑھ کر خدمت کی جس دن صبح کو والدہ کا انتقال ہوا اس رات میں انہوں نے مجھ سے عہد لیا کہ تیری بیوی نے میری خدمت اولاد سے زیادہ کی ہے تو ہمیشہ اس کا خیال رکھنا اب صرف یہ دعا کرتا ہوں کہ حشر میں والدہ کے سوال پر وہ میری شکایت کا دفتر نہ کھولے ورنہ تو وہی بات ہوگی۔

بڑا مزہ ہو جو محشر میں ہم کریں شکوہ
وہ منتوں سے کہیں چپ رہو خدا کے لیے

(ماخوذ: لالہ وگل، مرتب: مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی، ناشر: بیت الحکمت دیوبند، سن اشاعت: ۲۰۰۰ء)

☆......☆......☆

(صفحہ نمبر 55 کا بقیہ)

یہ اجمالی کیفیت اس لیے لکھ دی گئی ہے کہ بعد میں آنے والے عزیز واقرباء اور احباب فی الجملہ ان کی زندگی سے واقف ہوسکیں اور دعاء میں یاد رکھیں، اسی وجہ سے یہ تحریر محافظ خانہ دارالعلوم میں بھی بضمن مسل متعلقہ پیغاماتِ تعزیت بحفاظت رکھوادی گئی ہے جو بعد میں حسب ضرورت تاریخ کا کام دے سکے گی۔

بس اتنی سی حقیقت ہے فریب خواب ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

ماخوذ: تواریخ وشخصیات حکیم الاسلام، مرتب: مولانا محمد عمران قاسمی بگیانوی، ناشر: فرید بکڈپو دریا گنج نئی دہلی، سن اشاعت: نومبر ۲۰۰۶ء